افسانے اور ڈرامے

سعادت حسن منٹو

ساقی بک ڈپو، دہلی ۶

قیمت : پینتیس (۳۵) روپے

Rs. 35/=

ISBN 81-85772-04-5

کتاب : افسانے اور ڈرامے

مصنف : سعادت حسن منٹو

جدید ایڈیشن : ۱۹۹۳ء

طابع : فائن آفسیٹ پریس لونی روڈ، دہلی

ناشر

ساقی بک ڈپو

اردو بازار۔ دھلی ۱۱۰۰۰۶

AFSANE AUR DRAME •

SAADAT HASSAN MINTO

SAQI BOOK DEPOT

4157-A, Urdu Bazar, DELHI-110006

تسنیم کے نام

فہرس

(۱) بلاؤز	۹
(۲) قانون کی حفاظت	۲۳
(۳) شیرُو	۳۵
(۴) ایک مرد	۴۸
(۵) مِس فریا	۷۳
(۶) تین اُنگلیاں	۹۳
(۷) آم	۱۱۷
(۸) دو ہزار سال بعد	۱۲۹

(۹) خونی تھوک ۱۲۲

(۱۰) تین تحفے ۱۴۸

(۱۱) مسز ڈلمی سیلوا ۱۷۵

(۱۲) تحفہ ۱۸۸

(۱۳) غسل خانہ ۲۱۴

پیش لفظ

مگر اس کی ضرورت ہی کیا ہے......

سعادت حسن منٹو

بمبئی ۲۸ر نومبر ۱۹۴۳ء

بلاؤز

کچھ دنوں سے مومن بہت بیقرار تھا۔ اسکو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کا سارا وجود کچا پھوڑا بن گیا ہے۔ کام کرتے وقت باتیں کرتے ہوئے حتیٰ کہ سوچنے پر بھی اُسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ ایسا درد جس کو وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کرسکتا۔

بعض اوقات بیٹھے بیٹھے وہ ایکدم چونک پڑتا۔ دھندلے دھندلے خیالات جو عام حالتوں میں بے آواز بلبلوں کی طرح پیدا ہو کر مٹ جایا کرتے ہیں مومن کے دماغ میں بڑے شور کے ساتھ پیدا ہوتے تھے اور شور ہی کے ساتھ پھٹتے تھے اس کے علاوہ اس کے دل و دماغ کے نرم و نازک پردوں پر ہر وقت جیسے خاردار پاؤں والی چیونٹیاں سی رینگتی تھیں ایک عجیب قسم کا کھنچاؤ اس کے اعضاء میں پیدا ہو گیا تھا جسکے باعث اسے بہت تکلیف ہوتی تھی اس تکلیف کی شدت جب بڑھ جاتی تو اسکے جی میں آتا کہ اپنے آپکو ایک بڑے سے ہاون میں ڈالدے اور کسی سے کہے "مجھے کوٹنا شروع کردو۔"

باورچی خانہ میں گرم مصالحہ کوٹتے وقت جب لوہے سے لوہا ٹکراتا اور دھمکوں سے

چھت میں ایک گونج سی دوڑ جاتی تو مومن کے ننگے پیروں کو یہ لرزش بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ پیروں کے ذریعے سے یہ لرزش اسکی تنی ہوئی پنڈلیوں اور رانوں میں دوڑتی ہوئی اسکے دل تک پہونچ جاتی جو تیز ہوا میں رکھے ہوئے دیئے کی طرح کانپنا شروع کردیتا۔

مومن کی عمر پندرہ برس کی تھی شاید سولہواں بھی لگا ہو۔ اُسے اپنی عمر کے متعلق صحیح اندازہ نہیں تھا۔ وہ ایک صحت مند اور تندرست لڑکا تھا جس کا لڑکپن تیز قدم سے جوانی کے میدان کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اسی دوڑ نے جس سے مومن بالکل غافل تھا۔ اس کے لہو کے ہر قطرے میں سنسنی پیدا کردی تھی۔ وہ اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا تھا مگر ناکام رہتا تھا۔

اس کے جسم میں کئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ گردن جو پہلے پتلی تھی اب موٹی ہوگئی تھی۔ باہوں کے پٹھوں میں اینٹھن سی پیدا ہوگئی تھی۔ کنٹھ نکل رہا تھا۔ سینے پر گوشت کی تہ موٹی ہوگئی تھی اور اب کچھ دنوں سے پستانوں میں گولیاں سی پڑ گئی تھیں جگہ ابھر آئی تھی جیسے کسی نے ایک ایک بنٹا اندر داخل کردیا ہے ان ابھاروں کو ہاتھ لگانے سے مومن کو بہت درد محسوس ہوتا تھا۔ کبھی کبھی کام کرنے کے دوران میں غیر ارادی طور پر جب اس کا ہاتھ ان گولیوں سے چھو جاتا تو وہ تڑپ اٹھتا قمیص کے موٹے اور کھردرے کپڑے سے بھی اس کو تکلیف دہ سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی۔

غسل خانے میں نہاتے وقت یا باورچی خانے میں جب کوئی اور موجود نہ ہو مومن اپنے قمیص کے بٹن کھول کر ان گولیوں کو غور سے دیکھتا تھا۔ ہاتھوں سے مسلتا تھا درد ہوتا، ٹیسیں اٹھتیں اس کا سارا جسم پھلوں سے لدے ہوئے پیڑ کی طرح جسے زور سے ہلایا گیا ہو کانپ جاتا۔ مگر اس کے باوجود وہ اس درد پیدا

کرنے والے کھیل میں مشغول رہتا تھا۔ کبھی کبھی زیادہ دبانے پر یہ گولیاں پچک جاتیں اور ان کے منہ سے لیسدار لعاب نکل آتا اس کو دیکھ کر اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سرخ ہو جاتا۔ وہ یہ سمجھتا کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے۔

گناہ اور ثواب کے متعلق مومن کا علم بہت محدود تھا۔ ہر وہ فعل جو ایک انسان دوسرے انسانوں کے سامنے نہ کر سکتا ہو اسکے خیال کے مطابق گناہ تھا چنانچہ جب شرم کے مارے اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سرخ ہو جاتا تو وہ جھٹ سے اپنی قمیص کے بٹن بند کر لیتا کہ آئندہ ایسی فضول حرکت کبھی نہیں کریگا لیکن اس عہد کے باوجود دوسرے تیسرے روز نکلتے میں پھر اسی کھیل میں مشغول ہو جاتا۔

مومن سے گھر والے سب خوش تھے۔ وہ بڑا محنتی لڑکا تھا۔ سب کام وقت پر کر دیتا تھا۔ اور کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتا تھا۔ ڈپٹی صاحب کے یہاں اُسے کام کرتے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے تھے لیکن اس قلیل عرصے میں اس نے گھر کے ہر فرد کو اپنی محنت کش طبیعت سے متاثر کر لیا تھا۔ چھ روپے مہینے پر وہ نوکر ہوا تھا۔ . . . . مگر دوسرے مہینے ہی اسکی تنخواہ میں دو روپے بڑھا دیئے گئے تھے۔ وہ اس گھر میں بہت خوش تھا اس لئے کہ اسکی یہاں قدر کیجاتی تھی۔ مگر وہ اب کچھ دنوں سے بیقرار تھا۔ ایک عجیب قسم کی آوارگی اس کے دماغ میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سارا دن بے مطلب بازاروں میں گھومتا پھرے یا کسی سنسان مقام پر جا کر لیٹا رہے۔

اب کام میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ لیکن اس بے دلی کے ہوتے ہوئے بھی وہ کاہلی نہیں برتتا تھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ گھر میں کوئی بھی اس کے

اندرونی انتشار سے واقف نہیں تھا۔ رضیہ تھی سو وہ دن بھر باجہ بجانے۔ نئی نئی فلمی طرزیں سیکھنے اور رسالے پڑھنے میں مصروف رہتی تھی۔ اس نے کبھی مومن کی نگرانی ہی نہیں کی تھی۔ شکیلہ البتہ مومن سے ادھر ادھر کے کام لیتی تھی اور کبھی کبھی اسے ڈانٹتی بھی تھی مگر اب کچھ دنوں سے وہ چند بلاؤزوں کے نمونے اتارنے میں بے طرح مشغول تھی۔ یہ بلاؤز اسکی ایک سہیلی کے تھے جسے نئی نئی تراشوں کے کپڑے پہننے کا بہت شوق تھا۔ شکیلہ اس سے آٹھ بلاؤز مانگ کر لائی تھی اور کاغذوں پر ان کے نمونے اتار رہی تھی چنانچہ اس نے بھی کچھ دنوں سے مومن کیطرف دھیان نہیں دیا تھا۔

ڈپٹی صاحب کی بیوی سخت گیر عورت نہیں تھی۔ گھر میں دو نوکر تھے۔ یعنی مومن کے علاوہ ایک بڑھیا بھی تھی۔ زیادہ تر باورچی خانے کا کام ہی کرتی تھی۔ مومن کبھی کبھی اس کا ہاتھ بٹا دیا کرتا تھا۔ ڈپٹی صاحب کی بیوی نے ممکن ہے مومن کی مستعدی میں کوئی کمی دیکھی ہو مگر اس نے مومن سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا اور وہ انقلاب جس میں سے مومن کا دل ودماغ اور جسم گزر رہا تھا اس سے تو ڈپٹی صاحب کی بیوی بالکل غافل تھی۔ چونکہ اس کا کوئی لڑکا نہیں تھا اس لئے وہ مومن کی ذہنی اور جسمانی تبدیلیوں کو نہیں سمجھ سکتی تھی اور پھر مومن نوکر تھا۔ نوکروں کے متعلق کون غور و فکر کرتا ہے۔ بچپن سے لیکر بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں پیدل طے کر جاتے ہیں اور آس پاس کے آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔

مومن کا بھی بالکل یہی حال تھا۔ وہ کچھ دنوں سے موڑ مڑتا زندگی کے ایک ایسے راستے پر آنکلا تھا جو زیادہ لمبا تو نہیں تھا مگر بیحد پُر خطر تھا اس راستے پر اسکے

قدم کبھی تیز تیز اٹھتے تھے کبھی ہولے ہولے وہ دراصل جانتا نہیں تھا کہ ایسے راستوں پر کس طرح چلنا چاہئے۔ انہیں جلدی طے کر جانا چاہئے یا کچھ وقت لیکر آہستہ آہستہ ادھر ادھر کی چیزوں کا سہارا لیکر طے کرنا چاہئے۔ مومن کے ننگے پاؤں کے نیچے آنے والے شباب کی گول گول چکنی بٹیاں پھسل رہی تھیں وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا تھا وہ بیحد مضطرب تھا۔ اسی اضطراب کے باعث کئی بار کام کرتے کرتے چونک کر وہ غیر ارادی طور پر کسی کھونٹی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتا اور اسکے ساتھ لٹک جاتا۔ پھر اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ ٹانگوں سے پکڑ کر اُسے کوئی اتنا کھینچے کہ وہ ایک مہین تار بن جائے۔ یہ سب باتیں اسکے دماغ کے کسی ایسے گوشے میں پیدا ہوتی تھیں کہ وہ ٹھیک طور پر ان کا مطلب نہیں سمجھ سکتا تھا۔

غیر شعوری طور پر وہ چاہتا تھا کہ کچھ ہو۔ — کیا ہو؟ —— بس کچھ ہو، میز پر قرینے سے چنی ہوئی پلیٹیں ایک دم اچھلنا شروع کر دیں۔ کیتلی پر رکھا ہوا ڈھکنا پانی کے ایک ہی ابال سے اوپر کو اڑ جائے۔ نل کی جستی نالی پر دباؤ ڈالے تو وہ دہری ہو جائے اور اس میں سے پانی کا ایک فوارہ سا پھوٹ نکلے اسے ایک ایسی زبردست انگڑائی آئے کہ اس کے سارے جوڑ علیحدہ علیحدہ ہو جائیں اور ایک ڈھیلا پن پیدا ہو جائے — کوئی ایسی بات وقوع پذیر ہو جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔

مومن بہت بے قرار تھا۔

رضیہ نئی قلمی طرزیں سیکھنے میں مشغول تھی اور شکیلہ کاغذ پر بلاؤز کے نمونے اتار رہی تھی جب اس نے یہ کام ختم کر لیا تو وہ نمونہ جو ان میں سب سے

اچھا تھا سامنے رکھ کر اپنے لئے اُودی ساٹن کا بلاؤز بنانا شروع کیا۔ اب رضیہ
کو بھی اپنا باجا اور فلمی گانوں کی کاپی چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔
شکیلہ ہر کام بڑے اہتمام اور چاؤ سے کرتی تھی۔ جب سینے پرونے بیٹھتی تو
اسکی نشست بڑی پر اطمینان ہوتی تھی۔ اپنی چھوٹی بہن رضیہ کی طرح وہ افراتفری
پسند نہیں کرتی تھی ایک ایک ٹانکا سوچ سمجھ کر بڑے اطمینان سے لگاتی تھی تاکہ
غلطی کا امکان نہ رہے۔ پیمائش بھی اسکی بہت صحیح ہوتی تھی اس لئے کہ وہ پہلے
کاغذ کاٹ کر پھر کپڑا کاٹتی تھی۔ یوں وقت زیادہ صرف ہوتا مگر چیز بالکل فٹ
تیار ہوتی ہے۔
شکیلہ بھرے بھرے جسم کی صحت مند لڑکی تھی۔ اس کے ہاتھ بہت
گدگدے تھے۔ گوشت بھری مخروطی انگلیوں کے آخر میں ہر جوڑ پر ایک ننھا گڑھا
تھا جب وہ مشین چلاتی تھی یہ ننھے ننھے گڑھے ہاتھ کی حرکت سے کبھی کبھی
غائب بھی ہو جاتے تھے۔
شکیلہ مشین بھی بڑے اطمینان سے چلاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اسکی دو یا
تین انگلیاں بڑی رعنائی کے ساتھ مشین کی ہتھی کو گھماتی تھیں اسکی کلائی
میں ایک ہلکا سا خم پیدا ہو جاتا تھا۔ گردن ذرا اس طرف کو جھک جاتی تھی او
بالوں کی ایک لٹ جسے شاید اپنے لئے کوئی مستقل جگہ نہیں ملتی تھی نیچے
آتی تھی شکیلہ اپنے کام میں اس قدر منہمک ہوتی تھی کہ وہ اسے ہٹانے
جمانے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔
جب شکیلہ اُودی ساٹن سامنے پھیلا کر اپنے ناپ کا بلاؤز تراشنے لگ

اسے ٹیپ کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ اُن کا اپنا ٹیپ گھس گھسا کر اب بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ لوہے کا گز موجود تھا مگر اس سے کمر اور سینے کی پیمائش کیسے ہو سکتی ہے۔ اُس کے اپنے کئی بلاؤز موجود تھے مگر اب چونکہ وہ پہلے سے کچھ موٹی ہو گئی تھی اس لئے وہ ساری پیمائشیں دوبارہ کرنا چاہتی تھی۔

قمیص اتار کر اس نے مومن کو آواز دی۔ جب وہ آیا تو اُس سے کہا "جاؤ مومن، دوڑ کر چھ نمبر سے کپڑے کا گز لے آؤ۔ کہنا شکیلہ بی بی مانگتی ہیں۔"

مومن کی نگاہیں شکیلہ کی سفید بنیان کے ساتھ ٹکرائیں وہ کئی بار شکیلہ بی بی کو ایسی بنیانوں میں دیکھ چکا تھا مگر آج اسے ایک عجیب قسم کی جھجک محسوس ہوئی اس نے اپنی نگاہوں کا رخ دوسری طرف پھیر لیا اور گھبراہٹ میں کہا "کیسا گز بی بی جی۔"

شکیلہ نے جواب دیا "کپڑے کا گز ــــ ایک گز تو یہ تمہارے سامنے پڑا ہے۔ لوہے کا ہے ایک دوسرا گز بھی ہوتا ہے جو کپڑے کا بنا ہوتا ہے۔ جاؤ چھ نمبر میں جاؤ اور دوڑ کے ان سے یہ گز لے آؤ۔ کہنا شکیلہ بی بی مانگتی ہیں۔"

چھ نمبر کا فلیٹ بالکل قریب تھا۔ مومن فوراً ہی کپڑے کا گز لیکر آ گیا۔ شکیلہ نے یہ گز اسکے ہاتھ سے لیا اور کہا "یہیں ٹھہر جاؤ۔ اسے ابھی واپس لے جانا۔" پھر وہ اپنی بہن رضیہ سے مخاطب ہوئی "ان لوگوں کی کوئی چیز زیادہ دیر اپنے پاس رکھ لی جائے تو وہ بڑھیا تقاضے کر کر کے پریشان کر دیتی ہے ــــ ادھر آؤ میرا گز لو اور یہاں سے میرا ناپ لو۔"

رضیہ نے شکیلہ کی کمر اور سینے کا ناپ لینا شروع کیا تو ان کے درمیان کئی باتیں ہوئیں۔ مومن دروازے کی دہلیز میں کھڑا تکلیف دہ خاموشی سے یہ باتیں سنتا رہا۔

رضیہ تم گز کھینچ کر ناپ کیوں نہیں لیتیں ــــ پچھلی دفعہ بھی یہی ہوا تم نے ناپ لیا

اور میرے بلاؤز کا ستیاناس ہو گیا۔ اوپر کے حصہ پر اگر کپڑا فٹ نہ آئے تو ادھر ادھر بغلوں میں جھول پڑ جاتے ہیں۔"

"کہاں کا لوں، کہاں کا نہ لوں، تم تو عجب مخمصے میں ڈال دیتی ہو۔ یہاں کا ناپ لینا شروع کیا تو تم نے کہا ذرا نیچے کا لو۔۔۔۔ ذرا چھوٹا بڑا ہو گیا تو کونسی آفت آ جائے گی۔"

"بھئی واہ۔۔۔ چیز کے فٹ ہونے ہی میں تو ساری خوبصورتی ہے۔ ثریا کو دیکھو کیسے فٹ کپڑے پہنتی ہے۔ مجال ہے جو کہیں شکن پڑے۔ کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں ایسے کپڑے ۔۔۔۔ لو اب ناپ لو۔۔۔۔۔۔"

یہ کہہ کر شکیلہ نے سانس کے ذریعے سے اپنا سینہ پھیلانا شروع کیا جب اچھی طرح پھول گیا تو سانس روک کر اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "لو اب جلدی کرو۔"

جب شکیلہ نے سینے کی ہوا خارج کی تو مومن کو ایسا محسوس ہوا اس کے اندر ربڑ کے کئی غبارے پھٹ گئے ہیں اس نے گھبرا کر کہا۔ "گز لائیے بی بی جی۔۔۔۔ میں دے آؤں"

شکیلہ نے اسے جھڑک دیا۔ "ذرا ٹھہر جاؤ۔"

یہ کہتے ہوئے کپڑے کا گز اس کے ننگے بازو سے لپٹ گیا جب شکیلہ نے اسے اتارنے کی کوشش کی تو مومن کو اس کی سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آیا۔ مومن کی اپنی بغلوں میں بھی ایسے ہی بال اُگ رہے تھے مگر یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس کی مونچھیں بن جائیں۔۔۔۔ بچپن میں وہ بھٹوں کے کالے اور سنہری بال نکال کر اپنی مونچھیں بنایا کرتا تھا۔ ان کو اپنے بالائی ہونٹ پر جماتے وقت جو اسے سرسراہٹ محسوس ہوا کرتی تھی اسی قسم کی سرسراہٹ اس خواہش نے اس کے بالائی ہونٹ اور

ناک میں پیدا کی۔

شکیلہ کا بازو اب نیچے جھک گیا تھا۔ اور اسکی بغل چھپ گئی تھی مگر مومن اب بھی کالے کالے بالوں کا وہ گچھا دیکھ رہا تھا اسکے تصور میں شکیلہ کا بازو دیر تک ویسے ہی اُٹھا رہا اور بغل میں سے اُس کے سیاہ بال جھانکتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد شکیلہ نے مومن کو گز دیدیا اور کہا "جاؤ، اُسے واپس دے آؤ کہنا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے"۔

مومن گز واپس دیکر باہر صحن میں بیٹھ گیا۔ اسکے دل و دماغ میں دھندلے دھندلے خیال پیدا ہو رہے تھے۔ دیر تک وہ ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا رہا جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے غیر ارادی طور پر اپنا چھوٹا سا ٹرنک کھولا جس میں اس نے عید کیلئے نئے کپڑے بنوا کر رکھے تھے۔

جب ٹرنک کا ڈھکنا کھلا اور نئے لٹھے کی بو اسکی ناک تک پہنچی تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ نہا دھو کر اور یہ نئے کپڑے پہن کر وہ سیدھا شکیلا بی بی کے پاس جائے اور اُسے سلام کرے ـــــ اسکی لٹھے کی شلوار کس طرح کھڑ کھڑ کریگی اور اسکی رومی ٹوپی......

رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی مومن کی نگاہوں کے سامنے اس کا پھندنا آگیا اور پھندنا فوراً ہی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھا تھا۔ اس نے کپڑوں کے نیچے سے اپنی نئی رومی ٹوپی نکالی اور اس کے نرم اور لچکیلے پھندنے پر ہاتھ پھیرنا شروع ہی کیا تھا کہ اندر سے شکیلہ بی بی کی آواز آئی "مومن"

مومن نے ٹوپی ٹرنک میں رکھی، ڈھکنا بند کیا اور اندر چلا گیا جہاں شکیلہ نمونے کے مطابق اودی ساٹن کے کئی ٹکڑے کاٹ چکی تھی۔ ان چمکیلے اور پھسل پھسل جانے والے ٹکڑوں کو ایک جگہ رکھ کر مومن کی طرف متوجہ ہوئی "میں نے تمہیں اتنی آوازیں دیں۔ سو گئے تھے کیا؟"

مومن کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی "نہیں بی بی جی"۔

"تو کیا کر رہے تھے؟"

"کچھ ..... کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ تو ضرور کرتے ہو گے"۔ شکیلہ یہ سوال کئے جا رہی تھی مگر اس کا اصل دھیان بلاؤز کی طرف تھا جسے اب اسے کچا کرنا تھا۔

مومن نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔ "ٹرنک کھول کر اپنے نئے کپڑے دیکھ رہا تھا"۔ شکیلہ کھلکھلا کر ہنسی۔ رضیہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

شکیلہ کو ہنستے دیکھ کر مومن کو ایک عجیب سی تسکین محسوس ہوئی اور اس تسکین نے اسکے دل میں یہ خواہش پیدا کی کہ وہ کوئی ایسی مضحکہ خیز طور پر احمقانہ حرکت کرے جس سے شکیلہ کو اور زیادہ ہنسنے کا موقع ملے، چنانچہ لڑکیوں کی طرح جھینپ کر اور لہجے میں تتراہٹ پیدا کر کے اس نے کہا "بڑی بی بی جی سے پیسے لیکر میں ریشمی رومال بھی لاؤں گا۔"

شکیلہ نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا "کیا کرو گے اس رومال کو؟"

مومن نے جھینپ کر جواب دیا۔ "گلے میں باندھ لونگا بی بی جی ___ بڑا اچھا معلوم ہو گا"۔ یہ سن کر شکیلہ اور رضیہ دونوں دیر تک ہنستی رہیں۔

گلے میں باندھو گے تو یاد رکھنا میں اسی سے پھانسی دے دوں گی تمہیں" یہ کہہ کر
شکیلہ نے اپنی ہنسی دبانے کی کوشش کی اور رضیہ سے کہا "کمبخت نے مجھے کام ہی
بھلا دیا" ۔ رضیہ میں تم اسے کیوں بلایا تھا؟"

رضیہ نے جواب نہ دیا اور وہ نئی فلمی طرز گنگنانا شروع کردی جو وہ دو روز سے
سیکھ رہی تھی اس دوران میں شکیلہ کو خود ہی یاد آگیا کہ اس نے مومن کو کیوں بلایا تھا
"دیکھو مومن میں تمہیں یہ بنیان اتار کر دیتی ہوں، دواؤں کی دکان کے پاس جو ایک دکان
نئی کھلی ہے نا، وہی جس میں تم اس دن میرے ساتھ گئے تھے وہاں جاؤ اور پوچھ کر آؤ کہ
ایسے چھ بنیانوں کا وہ کیا لے گا۔ کہنا ہم چھ لیں گے۔ اس لئے کچھ رعایت ضرور کرے" سمجھ لیا نا"

مومن نے جواب دیا "جی ہاں"

"اب تم پرے ہٹ جاؤ"

مومن باہر نکل کر دروازے کی اوٹ میں ہو گیا چند لمحات کے بعد بنیان اس کے
قدموں کے پاس آگرا اور اندر سے شکیلہ کی آواز آئی "کہنا ہم اسی قسم کی، اسی ڈیزائن کی
بالکل یہی چیز لیں گے۔ فرق نہیں ہونا چاہیئے۔"

مومن نے بہت اچھا کہہ کر بنیان اٹھا لیا جو پسینے کے باعث کچھ کچھ گیلا ہو رہا تھا
جیسے کسی نے بھاپ پر رکھ کر فوراً ہی ہٹا لیا ہو۔ بدن کی بو بھی اس میں بسی ہوئی تھی۔
میٹھی میٹھی گرمی بھی تھی۔ یہ تمام چیزیں اس کو بہت بھلی معلوم ہوئیں۔

وہ اس بنیان کو جو بلی کے بچے کی طرح ملائم تھا اپنے ہاتھوں میں مسلتا باہر چلا گیا
جب وہ بھاؤ دریافت کرکے بازار سے واپس آیا تو شکیلہ بلاوز کی سلائی شروع کر چکی تھی، اس
سیاہ ساٹن کے بلاؤز کی جو مومن کی نئی ٹوپی کے پھندنے سے کہیں زیادہ چمکیلی اور لچکیلی تھی

یہ بلاؤز شاید عید کے لئے تیار کیا جا رہا تھا کیونکہ عید اب بالکل قریب آ گئی تھی مومن
کو ایک دن میں کئی بار بلایا گیا۔ دھاگہ لانے کیلئے، استری نکالنے کیلئے سوئی ٹوٹی تو نئی
لانے کیلئے۔ شام کے قریب جب شکیلہ نے دوسرے روز پر جب باقی کا کام اٹھا دیا تو وہ دھاگے
کے ٹکڑے اور اُودی ساٹن کی بیکار کترنیں اٹھانے کے لئے بھی اسے بلایا گیا۔

مومن نے اچھی طرح جگہ صاف کر دی باقی سب چیزیں اٹھا کر باہر پھینک دیں مگر
اُودی ساٹن کی چمکدار کترنیں اپنی جیب میں رکھ لیں ـــــ بالکل بے مطلب کیونکہ
اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ان کو کیا کریگا۔

دوسرے روز اس نے جیب سے کترنیں نکالیں اور الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے
الگ کرنے شروع کر دیئے۔ دیر تک وہ اس کھیل میں مشغول رہا حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے بڑے
ٹکڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دباتا رہا، مسلتا رہا۔ لیکن
اس کے تصور میں شکیلہ کی وہی بغل تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا چھوٹا سا گچھا دیکھا تھا
اس دن بھی اُسے شکیلہ نے کئی بار بلایا۔ کالی ساٹن کے بلاؤز کی ہر شکل اس
کی نگاہوں کے سامنے آتی رہی۔ پہلے جب اسے کچا کیا گیا تھا اُس پر سفید دھاگے کے
بڑے بڑے ٹانکے جا بجا پھیلے ہوئے تھے پھر اس پر استری کی گئی جس سے سب شکنیں دور ہو گئیں
اور چمک بھی دوبالا ہو گئی۔ اُس کے بعد کچی حالت ہی میں شکیلہ نے اسے پہنا۔ رضیہ کو دکھایا
دوسرے کمرے میں سنگھار میز کے پاس جا کر آئینے میں خود اسکو ہر پہلو سے اچھی طرح دیکھا جب
پورا اطمینان ہو گیا تو اُسے اتارا جہاں جہاں تنگ یا کھلا تھا وہاں نشان بنائے اس کی
ساری خامیاں دور کیں ایک بار پہن کر دیکھا جب بالکل فٹ ہو گیا تو پکی سلائی شروع کی
ادھر اودی ساٹن کا یہ بلاؤز سیا جا رہا تھا اُدھر مومن کے دماغ میں عجیب و غریب

خیالوں کے جیسے ٹانکے سے اُبھر رہے تھے ۔۔ جب اسے کمرے میں بلایا جاتا اور اسکی نگاہیں چمکیلی ساٹن کے بلاؤز پر پڑتیں تو اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ہاتھ سے چھو کر اسے دیکھے مگر چھو کر ہی نہیں دیکھے بلکہ اسکی ملائم اور روشن دار سطح پر دیر تک ہاتھ پھیرتا رہا ۔ اپنے کھردرے ہاتھ۔

اس نے اس ساٹن کے ٹکڑوں سے اسکی ملائمی کا اندازہ کر لیا تھا۔ دھاگے جو اس نے ان ٹکڑوں سے نکالے تھے اور بھی زیادہ ملائم ہو گئے تھے جب اس نے ان کا پھاہا بنایا تھا تو دباتے وقت اسے معلوم ہوا کہ ان میں بڑی سی لچک بھی ہے ۔۔ وہ جب بھی اندر آکر بلاؤز کو دیکھتا اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے تھے۔ کالے کالے بال۔ مومن سوچتا تھا کیا وہ بھی لیس ساٹن ہی کی طرح ملائم ہیں؟

بلاؤز بالآخر تیار ہو گیا ۔ مومن کمرے کے فرش پر گیلا کپڑا پھیر رہا تھا کہ شکیلہ اندر آئی۔ قمیص اتار کر اس نے پلنگ پر رکھی اس کے نیچے اسی قسم کا سفید بنیان تھا جس کا نمونہ لے کر مومن بھاؤ دریافت کرنے گیا تھا ۔ اس کے اوپر شکیلہ نے اپنے ہاتھ کا سلا ہوا بلاؤز پہنا۔ سامنے کے ہک لگائے اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

مومن نے فرش صاف کرتے کرتے آئینے کی طرف دیکھا۔ بلاؤز میں اب جان پڑ گئی تھی ایک دو جگہ پر وہ اس قدر چمکتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ساٹن کا رنگ سفید ہو گیا ہے۔

شکیلہ کی پیٹھ مومن کی طرف تھی جس پر ریڑھ کی ہڈی کی لمبی جھری بلاؤز فٹ ہونے کے باعث اپنی پوری گہرائی کے ساتھ نمایاں تھی مومن سے نہ رہ گیا چنانچہ اس نے کہا۔ بی بی جی آپ نے تو درزیوں کو بھی مات کر دیا۔

شکیلہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوئی مگر وہ رضیہ کی رائے طلب کرنے کیلئے بے قرار تھی اس لئے وہ صرف "اچھا سلا ہے نا؟" کہہ کر باہر دوڑ گئی ۔۔۔ مومن آئینے کیطرف

دیکھتا رہ گیا جس میں بلاوز کا سیاہ اور چمکیلا عکس دیر تک موجود رہا۔

رات کو جب وہ پھر اس کمرے میں صراحی رکھنے کے لئے آیا تو اس نے کھونٹی پر کپڑوں کے ہینگر میں اس بلاوز کو دیکھا۔ کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ چنانچہ آگے بڑھ کر پہلے اس نے اسے غور سے دیکھا پھر ڈرتے ڈرتے اس پر ہاتھ پھیرا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے یہ محسوس ہوا کہ کوئی اسکیمو کے ملائم روئیں پر ہولے ہولے بالکل ہوائی لمس کی طرح ہاتھ پھیر رہا ہے

رات کو جب وہ سویا تو اس نے کئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھے۔ ڈپٹی صاحب نے پتھر کے کوئلوں کا ایک بڑا ڈھیر اسے کوٹنے کو کہا۔ جب اس نے ایک کوئلہ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا ــــــ یہ کالی کھانڈ کے مہین مہین تار تھے جن کا گولا بنا ہوا تھا ــــــ پھر یہ گولے کالے رنگ کے غبارے بن کر ہوا میں اڑنا شروع ہوئے ــــــ بہت اوپر جا کر یہ پھٹنے لگے ــــــ پھر آندھی آگئی اور مومن کی رومی ٹوپی کا پھندنا کہیں غائب ہو گیا ــــــ پھندنے کی تلاش میں وہ نکلا.... دیکھی ان دیکھی جگہوں میں گھومتا رہا..... نئے لٹھے کی بو بھی کہیں سے آنا شروع ہوئی، پھر نہ جانے کیا ہوا..... ایک کالی ساٹن کے بلاوز پر اس کا ہاتھ پڑا..... کچھ دیر وہ اس دھڑکتی ہوئی چیز پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا تھوڑی دیر تک تو وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے اس کے بعد اسے خوف، تعجب اور ایک انوکھی ٹیس کا احساس ہوا اس کی حالت اس وقت عجیب و غریب تھی.....

پہلے اسے تکلیف دہ حرارت محسوس ہوتی تھی مگر چند لمحات کے بعد ایک ٹھنڈی سی لہر اس کے جسم پر رینگنے لگی۔

۲۳

قانون کی حفاظت

افراد

سالگ رام .... وکیل — سَروپ .... موکل

چمپا .... وکیل کی لڑکی — ساوِتری .... وکیل کی بیوی

اور منشی

پہلا منظر

ایک بڑا کمرہ جیسا کہ عام طور پر کامیاب وکیلوں اور بیرسٹروں کا ہوتا ہے اس کے وسط میں ایک بہت بڑا میز ہے جس پر بیشمار کاغذات پڑے ہیں۔ کچھ بلندوں کی صورت میں، کچھ بکھرے ہوئے اور کچھ ڈھیر میں، سامنے ریک میں بھاری بھر کم کتابیں رکھی ہیں۔ کمرے کی دیواروں کے ساتھ بڑی بڑی الماریاں ہیں جو قانونی کتابوں سے بھری ہوئی ہیں اس میز کے ساتھ گھومنے والی کرسی پر وکیل صاحب بیٹھے ہیں۔ ان کے ایک طرف فرش پر ان کا منشی

چشمہ چڑھائے ڈیسک کے پاس بیٹھا ہے اور کاغذات دیکھنے میں مصروف ہے وکیل صاحب کے سامنے ان کا موکل بیٹھا ہے جو اپنی گفتگو ختم کر چکا ہے اور جانے کے قریب ہے۔

وکیل :۔ منشی جی۔ ان کے مقدمے کی تاریخ وغیرہ نوٹ کر لو اور دیکھو کل مجھے یاد سے یہ کاغذات دے دینا تاکہ میں ان کا مطالعہ کر لوں ــــ آج تاریخ کیا ہے؟

منشی :۔ آٹھ!

وکیل :۔ مہینہ؟

منشی :۔ مارچ!

وکیل :۔ سن؟

منشی :۔ چالیس!

وکیل (موکل سے) معاف کیجئے گا میرا حافظہ بہت کمزور ہے۔ کثرت کار کے باعث مجھے بہت سی باتیں بھول جاتی ہیں۔ کیا کہا تھا منشی جی سن کیا ہے؟ چالیس۔ آٹھ مارچ سن چالیس ــــ یہ لیجئے رسید (موکل رسید لیتا ہے) آپ کا اسم گرامی نہیں ــــ ہنس ــــ یہاں لکھا تو ہے ــــ ہاں مسٹر نرائن اب آپ تشریف لیجا سکتے ہیں۔ پرماتما نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

نرائن :۔ (اٹھ کر) اچھا نمسکار وکیل صاحب

وکیل :۔ نمسکار!

(نرائن چلا جاتا ہے۔ وکیل میز پر کتابوں کو الٹ پلٹ کرتا ہے)

وکیل :۔ (ایک کتاب ٹرے سے اٹھاتے ہوئے) ہاں منشی جی اب کیا ہے؟

منشی :۔ ایک اور موکل باقی رہ گیا ہے ۔ نوجوان چھوکرا ہے ۔ کہتا ہے کہ آپ سے کوئی قانونی مشورہ کرنا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کوئی ایسی ویسی بات کر بیٹھا ہے ۔

(فرش پر سے اُٹھتا ہے اور دروازے کی جانب چلتا ہے)

وکیل :۔ یہاں جو بھی آتا ہے ۔ ایسی ویسی بات ہی کر کے آتا ہے ۔ بھیجو اسے اندر۔

(منشی باہر جا کر ایک نوجوان آدمی کو ساتھ لاتا ہے)

سروپ :۔ گڈ مارننگ

وکیل :۔ گڈ مارننگ

(منشی اپنی جگہ بیٹھ جاتا ہے)

سروپ (کرسی پر بیٹھ کر) میں نے اپنے ایک دوست سے آپکی بہت تعریف سنی ہے ۔ ویسے اخباروں میں بھی آپ کا نام پڑھتا رہا ہوں مجھے دراصل آپ سے ایک قانونی مشورہ لینا ہے ۔

وکیل :۔ بڑے شوق سے ۔ مگر آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میری فیس بہت زیادہ ہے ۔

سروپ :۔ کچھ بھی زیادہ نہیں — میں دگنی فیس دینے کیلئے تیار ہوں اگر آپ مجھے کوئی ایسا راستہ بتائیں — مگر ٹھہریئے — پہلے آپ یہ بتائیے کیا اچھا قانون داں قانون توڑ سکتا ہے ؟

وکیل :۔ کیوں نہیں قانون بنائے ہی اس لئے گئے ہیں کہ توڑے جائیں اچھا قانون داں جب چاہے قانون کو توڑ مروڑ سکتا ہے ۔

سروپ :۔ تو میں عرض کروں میں کیا چاہتا ہوں ؟

وکیل :۔ فرمائیے !

سروپ ۔میرا نام رام سروپ ہے ۔۔۔ میں بی اے میں پڑھتا ہوں ۔۔۔ ایک
لڑکی سے مجھے پریم ہو گیا ہے جس کا نام ۔۔۔ میں بتا دوں تو کوئی ہرج تو نہیں
ہو گا ؟ ۔۔۔ یعنی وہ آپ ہی تک رہے گا نا ؟

وکیل :۔صاحبزادے ایسے کوئیں کے کوئیں خالی کر دیئے مگر اب خشک ہے کہو جو کچھ
تمہیں کہنا ہے بے خوف ہو کے کہو۔ ڈاکٹروں اور وکیلوں کو سب بھید بتانے پڑتے ہیں

سروپ :۔ہاں تو وکیل صاحب بات یہ ہے کہ مجھے ایک لڑکی سے جس کا نام چمپا ہے
بیحد محبت ہو گئی ہے۔ اس کو بھی مجھ سے پریم ہے ۔

وکیل :۔تو مشکل کیا ہے ۔۔۔ کیا کہا ۔۔۔ لڑکی کا نام کیا ہے ؟

سروپ :۔چمپا ۔۔۔ !

وکیل :۔ہوں ۔۔۔ تو اب مشکل کیا آن پڑی ہے ۔۔۔ تم کو ۔۔۔ ؟

سروپ :۔جی نہیں۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر مشکل یہ ہے کہ اسکے
والدین راضی نہیں ہونگے اسلئے کہ اسکی بات کہیں اور پکی کر دی گئی ہے۔ میں اب
یہ چاہتا ہوں کہ اس کو اغوا کر کے لیجاؤں اور کسی دوسرے شہر میں اس سے
باقاعدہ شادی کر لوں ۔۔۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟

وکیل :۔اس کو اغوا کر کے لے جاؤ۔ جانتے ہو اس جرم کی سزا کتنی زبردست ہے ؟

سروپ :۔مجھے معلوم ہے۔ مگر لڑکی رضامند ہے یعنی جب میاں بیوی راضی تو کیا کریگا قاضی
جب اسکو میری دھرم پتنی بننا منظور ہے تو سزا اور جرم کا سوال ہی کہاں باقی رہتا ہے

وکیل :۔اغوا کے بعد اگر لڑکی پر اس کے ماں باپ نے اثر ڈالا اور اسے مجبور کیا کہ وہ تمہارے
خلاف بیان دے تو سزا اور جرم کا سوال پیدا ہو سکتا ہے ایسے معاملوں میں وثوق سے

کچھ نہیں کہنا چاہئے کیونکہ لڑکیاں عام طور پر والدین کے دباؤ میں آجایا کرتی ہیں۔

سردیپ:۔ بس بس۔ آپ نے میرا مطلب سمجھ لیا۔ اسی غرض سے میں آپکی خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ کوئی ایسی ترکیب بتایئے کہ ان جھگڑوں کا خوف ہی نہ رہے۔ یعنی کسی بات کا ڈر نہ ہو اور میں اپنا کام بڑے آرام سے کر دوں۔

وکیل:۔ تم اس اغوا میں مجھ سے مدد لینا چاہتے ہو۔

سردیپ:۔ بالکل نہیں ـــ میں صرف قانونی حفاظت چاہتا ہوں۔ اول تو یہ اغوا غیر قانونی ہے اس لئے کہ چمپا میرے ساتھ بھاگنے کو بالکل تیار ہے۔ دوسرے ہم ایک دوسرے سے پریم کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی میں ایک آدھ رومانس تو ہو۔ وکیل صاحب آپ نے دنیا دیکھی ہے آپ کو اس بات کا ضرور احساس ہوگا کہ ایسے واقعات بڑھاپے میں بڑے مزے دیا کرتے ہیں۔ تو غرض یہ ہے کہ کوئی ایسا گر بتایئے جس سے بے کھٹکے اپنا کام کر جاؤں ـــ بس لطف آجائے۔

وکیل:۔ میں سمجھ گیا۔ دیکھو اس کیلئے تمہیں تین چار چیزوں کی ضرورت ہے ـــ لڑکی کا نام کیا ہے؟

سردیپ:۔ چمپا ـــ!

وکیل:۔ ہاں تو چمپا سے تم اغوا کے ایک روز پہلے ایک خط حاصل کر لو جس میں وہ تم سے شادی کی درخواست کرے بس یہ لکھا ہو کہ وہ گھر والوں سے بالکل تنگ آگئی ہے اس لئے وہ تم سے شادی کرنیکا عہد کر چکی ہے چنانچہ اس غرض سے وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر تمہارے پاس آرہی ہے۔ کیا وہ ایسا خط لکھ دے گی؟

سردیپ:۔ کیوں نہیں۔ میں اس سے فوراً لکھوا لوں گا۔

وکیل :۔ یہ تو ایک چیز ہوئی جو کہ بہت ضروری تھی۔ اب اگر لڑکی کے ماں باپ نے یہ کہا کہ وہ بہت سا روپیہ نقد اور ہزاروں روپے کا زیور بھی ساتھ لے گئی ہے جو اس نے تمہاری تحویل میں دے دیا ہے تو اس کا جواب کیا دیا جائیگا؟ ظاہر ہے کہ یہ بالکل جھوٹ ہوگا مگر تمہیں پریشان تو کیا جا سکتا ہے اس لئے اس کا توڑ بھی پہلے ہی سوچا ہوگا۔

سروپ :۔ جی ہاں! —— کیوں نہیں؟

(وکیل اٹھ کر کمرے میں ٹہلتا ہے)

وکیل :۔ (کچھ سوچ کر) اغوا رات کو کرو گے یا دن کو؟

سروپ :۔ دن کو۔ اس لئے کہ رات کو نو بجے کے بعد میں بالکل جاگ نہیں سکتا۔

وکیل :۔ یہ بھی اچھا ہوا۔ اچھا تو وہ لڑکی اپنے ساتھ زیور وغیرہ تو نہیں لائے گی؟

سروپ :۔ جی نہیں!

وکیل (ٹہلتے ہوئے) تو ایسا کرو کہ اغوا کے فوراً بعد تم اپنے کسی دوست کو اس علاقے کی پولیس چوکی میں جہاں اس لڑکی کا مکان ہو بھیج دو۔ وہ تھانے میں یہ جھوٹی رپورٹ لکھوائے کہ چمپا کے گھر میں زبردست چوری ہوگئی ہے۔ اگر ہو سکے تو وہ تھانیدار کو اس مکان تک بھی لے جائے اور آپ بھاگ جائے۔

سروپ :۔ اس سے کیا ہوگا؟

وکیل :۔ پولیس وہاں جائے گی اور اسے یہ معلوم ہوگا کہ چوری کی اطلاع غلط تھی، گھر والے اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے اور رجسٹر میں یہ لکھا جائے گا کہ فلاں آدمی کے گھر میں چوری ہونے کی جو اطلاع ملی تھی غلط ہے۔ تاریخ اور وقت وغیرہ سب رپورٹ میں درج ہوگا جو اس بات کا ثبوت ہوگا کہ چمپا اپنے

ساتھ کچھ بھی نہیں لاتی۔

گروپ (خوشی سے اچھل کر) وہ مارا۔ کیا کہنے ہیں آپ کے وکیل صاحب ۔۔۔ کیا نکتہ پیدا کیا ہے۔

وکیل :۔ (کرسی پر بیٹھ کر) تم لڑکی کو کالج ہی سے بھگا کر لے جانے کا ارادہ رکھتے ہو نا؟

گروپ :۔ جی ہاں! لیکن اگر آپ چاہیں ۔۔۔ یعنی یہ کوئی ضروری نہیں کہ اُسے کالج ہی سے اغوا کیا جائے۔ آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی کروں گا۔

وکیل :۔ نہیں۔ نہیں کالج ہی اچھا ہے۔ تو ایک بات یہ کرنا کہ کالج سے نکل کر تم دونوں کسی فوٹو گرافر کے پاس چلے جانا اور اپنا فوٹو کھچوا لینا۔

گروپ :۔ یہ فوٹو پاس رکھ لیا جائے۔

وکیل :۔ نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں فوٹو گرافر کے پاس وہ بالکل محفوظ رہے گا۔ اگر ضرورت پڑی تو فوراً منگا لیا جائے گا۔

گروپ :۔ اس کی کیا ضرورت ہوگی۔

وکیل :۔ صاحبزادے! اس سے یہ ثابت ہوگا کہ اس روز لڑکی کے پاس چند زیور تھے جو اس نے پہن رکھے تھے اور اس بات کا ضرور خیال رہے کہ لڑکی اپنی ماں کو یا باپ کو کسی ذریعہ سے مطلع کر دے کہ وہ اب گھر نہیں آئے گی اس لئے کہ وہ تمہارے ساتھ جا رہی ہے اور دیکھو اگر تم شادی کے دعوتی رقعے چھپوا کر اپنے دوستوں میں تقسیم کر دو تو بڑا اثر رہے گا۔ شادی تم اغوا ہی کے روز کر دو گے نا؟

گروپ :۔ جی ہاں۔

وکیل :۔ (اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) تو ابھی جا کر رقعے چھپوالو بعد اپنے ان دوستوں اور رشتہ داروں کے نام پوسٹ کر دو جو دوسرے شہروں میں رہتے ہوں۔ شادی کا انتظام وغیرہ تو ہو چکا ہے نا؟

گروپ :۔ (اٹھ کر) جی ہاں! سب انتظام مکمل ہے۔

وکیل :۔ تو جاؤ بے کھٹکے اپنا کام کرو۔ قانون تمہاری حفاظت کرے گا۔

گروپ :۔ شکریہ وکیل صاحب بہت بہت شکریہ۔ اب تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں لوہے کے جنگلے کے پیچھے کھڑا ہوں۔ کوئی ہاتھ مجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ رہی آپ کی فیس میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔

(تین نوٹ دس دس کے بٹوے سے نکال کر وکیل کو دیتا ہے۔ وکیل مسکرا کر نوٹ پکڑتا ہے اور میز پر ایک بلوریں پیپر ویٹ کے نیچے رکھ دیتا ہے)

گروپ :۔ اچھا! نمسکار وکیل صاحب

وکیل :۔ (مسکراتے ہوئے) نمسکار

(گروپ چلا جاتا ہے)

وکیل :۔ (منشی سے مخاطب ہو کر) لوگ سمجھتے ہیں کہ اُفتاد آ پڑنے کے بعد ہی وکیلوں سے مشورہ لینا چاہئے۔ یہ غلط ہے۔ اُفتاد سے پہلے وکیل زیادہ فائدہ مند ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر غلطی کرنے سے پہلے وکیل کی رائے طلب کر لی جائے تو جیل خانے اتنے آباد نہ ہوں اور نہ کچہریوں میں اتنی رونق ہو۔ وکیل کے پیشے کا صحیح مطلب آج اس چھوکرے نے سمجھا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اب بالکل محفوظ ہے

منشی :۔ جی ہاں! اس میں کیا شک ہے؟

وکیل :۔ (مسکراتا ہے اور پیپر ویٹ کے نیچے سے نوٹ نکال کر جیب میں رکھ لیتا ہے)
بڑا محتاط لڑکا تھا۔

منظر
دوسرا

سالگ رام وکیل کا گھر ـــــ ڈرائنگ روم ـــــ وکیل کی بیوی ایک صوفے پر بیٹھی ادنی بنیان بن رہی ہے۔ سامنے دیوار پر ایک خوبصورت لڑکی کے فوٹو کا انلارجمنٹ خوبصورت فریم میں لٹکتا دکھائی دیتا ہے ـــــ پردہ اٹھتا ہے تو چند لمحات کے توقف کے بعد سالگ رام وکیل ہاتھ میں ایک کارڈ لئے ہنستا ہنستا اندر داخل ہوتا ہے۔

وکیل کی بیوی (ہنستے ہنستے اپنے شوہر کی طرف دیکھتی ہے) یہ آج اتنی ہنسی کیوں آ رہی ہے؟
(وکیل جواب نہیں دیتا۔ ہیٹ اتار کر ایک طرف رکھتا ہے لیکن اس دوران میں بھی اس کی ہنسی بند نہیں ہوتی)

وکیل کی بیوی :۔ ضرور تم نے وہ بات سن لی ہوگی؟

وکیل :۔ (ہنستے ہنستے) کونسی بات؟ میں تو شادی کا یہ کارڈ پڑھ کر ہنس رہا تھا (ہنستا ہے) اس نے مجھے ایک کارڈ بھیج دیا۔ آج کل کے یہ لونڈے کتنے شریر ہوتے ہیں۔

وکیل کی بیوی :۔ جانے کیا کہتے ہو میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہ آیا اور سنتے ہو آج کیا تماشا ہوا۔ پولیس کی چوکی سے ایک آدمی آیا۔

وکیل :۔ (حیرت سے) پولیس کی چوکی سے؟ کیوں؟

بیوی :۔ یہ پوچھنے آیا تھا کہ ہمارے گھر میں کتنے کی چوری ہوئی ہے۔ ہمارا کیا کچھ چرایا گیا ہے؟

وکیل :۔ (جلدی جلدی) پوچھتا تھا کہ ہمارے گھر میں کتنے کی چوری ہوئی ہے اور ـــ اور ـــ تم ـــ تم نے کہہ دیا کہ ہمارا کچھ بھی نہیں گیا ـــ تم نے اس سے کہدیا کہ ہماری کوئی چیز بھی نہیں چرائی گئی اور میرے بھگوان ـــ چمپا کہاں ہے؟ ـــ ارے ہاں ـــ اس نے بھی تو چمپا ہی کہا تھا۔

بیوی :۔ چمپا چمپا کیا کہہ رہے ہو چمپا ہوگی کالج میں ـــ تو اور میں اس سے کیا جھوٹ بولتی۔ یہ کہتی کہ ہمارا سب گھر بار لٹ گیا ہے ـــ جانے کس کی چوری ہوئی اور وہ موا ہمارے پاس چلا آیا ـــ میں نے اس سے کہا "ہمارے یہاں چور آ کے کیا کرینگے۔ ہمارا روپیہ بنک میں ہے زیور جو ہیں وہ بھی بنک میں ـــ وہ سو روپئے جو تم گھر کے خرچ کے لئے دے گئے تھے میز کے دراز میں محفوظ پڑے تھے۔

(وکیل کا سر چکرا اٹھا ہے اور وہ لڑکھڑا کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ اٹھتی ہے) ہے ہے تمہارے دشمنوں کو کیا ہو گیا ہے؟ چمپا کے پتا ـــ چمپا کے پتا

وکیل :۔ (بوکھلا کر) چمپا گئی ـــ چمپا گئی ـــ!

بیوی :۔ کہاں گئی؟ ـــ بس ابھی آتی ہوگی ـــ تم یہ بتاؤ کہ تمہارے دشمنوں کو تکلیف کیا ہے۔ ارے راما ـــ ارے راما ـــ ایک گلاس

ٹھنڈے پانی کا لا۔ بابوجی کے لئے ___ بھاگ کے لا ___ بھاگ کے ___ ہے ہے تمہارا رنگ تو ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا ہے۔

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

بیوی :۔ (چونگا اٹھا کر) ہلو ہلو ___ ہلو ___ میں بول رہی ہوں۔ چمپا کیا کہا؟ نہیں، نہیں تم نہیں جا سکتیں۔ تمہارے پتا جی بیمار ہیں۔

وکیل :۔ کون ہے؟ ___ کون ہے ___؟ چمپا ہے؟ کیا کہتی ہے؟ ___

بیوی :۔ چپ بھی کرو۔ سننے تو دو ___ کیا کہا ___ (تھوڑا وقفہ) ___ تم شادی کرنے جا رہے ہو ___ میرے بھگوان (چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتی ہے)

وکیل :۔ (بے ہوش بیوی کے پاس جا کر) ساوتری ___ ساوتری ___ کیا کہا ہے چمپا نے؟ ساوتری۔ ساوتری بے ہوش ہو گئی! رامارا ما ___ اور اما ___ کوئی بھی تو نہیں یہاں ___ ساوتری ___ ساوتری ___ چمپا گئی ___ وہ لونڈا لے گیا اُسے ___ اور میں نے ___ میں نے تیس روپے لے کر اسے سارے ڈھنگ بتا دیئے۔ مجھے موت کیوں نہیں آتی ___ میں اب کیا کروں؟ ساوتری۔ ساوتری ___ (اسکی بیوی بیہوشی میں چمپا چمپا کہتی ہے) چمپا گئی اور میں نے سارا قانون اس کے ہاتھ میں دیدیا ___ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں کتنا بے وقوف ہوں۔ وہ چمپا، چمپا کہتا رہا اور مجھے ذرا بھی شک نہ ہوا۔ شادی کے رقعے پر اپنا نام بھی دیکھا

اور میرے دماغ میں یہ بات نہ آئی ـــــ اُدراما ـــــ یہ کہاں مرگیا ہے آج ـــــ ساوتری ـــــ ساوتری ـــــ خط تو اس نے لکھوا لیا ہوگا۔ اس نے میرے کہے پر حرف بحرف عمل کیا ہوگا۔ (اٹھتا ہے اور ٹیلیفون کرنے لگتا ہے) ٹیلیفون کروں؟ ـــــ پر کسے کروں؟ (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے) ـــــ یہ کون ہے ـــــ یہ کون ہے ـــــ ہلو ـــــ ہلو ـــــ ہاں ـــــ ہاں ـــــ مس چمپا سالگ رام ـــــ کسی نے فوٹو وٹو تو نہیں کھنچایا یہاں سے (ریسیور رکھ دیتا ہے لیکن فوراً ہی کچھ یاد کرکے اُسے اٹھا لیتا ہے) ارے ہاں فوٹو؟ چمپا اور اس کا فوٹو ـــــ یہ کون فوٹوگرافر تھا؟ (غصے سے ریسیور پٹک دیتا ہے اور بے ہوش بیوی کی طرف جاتا ہے) ساوتری ـــــ ساوتری ـــــ پرماتما کے لئے ہوش میں آؤ۔ پرماتما کے لئے ہوش میں آؤ ـــــ اب میں بے ہوش ہونا چاہتا ہوں ـــــ ساوتری ـــــ ساوتری ـــــ (بے ہوش ہو جاتا ہے)

پردہ

شیرو

چیڑ اور دیودار کے ناہموار تختوں کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا مکان تھا جسے جبلی جھونپڑا کہنا بجا ہے۔ دو منزلیں تھیں بھٹیار خانہ تھا جہاں کھانا پکایا اور کھایا جاتا تھا۔ اور بالائی منزل مسافروں کی رہائش کے لئے مخصوص تھی۔ یہ منزل دو کمروں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے ایک کافی کشادہ تھا جس کا دروازہ سڑک کی طرف کھلتا تھا۔ دوسرا کمرہ جو طول و عرض میں اس سے نصف تھا۔ بھٹیار خانے کے عین اوپر واقع تھا۔ یہ میں نے کچھ عرصے کے لئے کرایہ پر لے رکھا تھا۔ چونکہ ساتھ والے حلوائی کے مکان کی ساخت بھی بالکل اسی مکان جیسی تھی اور ان دونوں جگہوں کے لئے ایک ہی سیڑھی بنائی گئی تھی۔ اس لئے اکثر اوقات حلوائی کی کتیا اپنے گھر جانے کے بجائے میرے کمرے میں چلی آتی تھی۔

اس عمارت کے تختوں کو آپس میں بہت ہی بھونڈے طریقے سے

جوڑا گیا تھا۔ پیچ بہت کم استعمال کئے گئے تھے۔ شاید اس لئے کہ ان کو لکڑی میں داخل کرنے میں وقت صرف ہوتا ہے۔ کیلیں کچھ اس بے ربطی سے ٹھونکی گئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا اس مکان کو بنانے والا بالکل اناڑی تھا۔ کیلوں کے درمیان فاصلہ کی یکسانی کا کوئی لحاظ نہ رکھا گیا تھا۔ جہاں ہاتھ ٹھہر گیا وہیں پر کیل ایک ہی ضرب میں چپت کر دی گئی تھی۔ یہ بھی نہ دیکھا گیا کہ لکڑی پھٹ رہی ہے یا کیل ہی بالکل ٹیڑھی ہو گئی ہے۔

چھت ٹین سے پاٹی ہوئی تھی جس کی قینچی میں چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ کمرے کے باقی تختوں کی طرح چھت کی کڑیاں بھی رنگ و روغن سے بے نیاز تھیں۔ البتہ ان پر کہیں کہیں چڑیوں کی سفید بیٹیں سفیدی کے چھینٹوں کے مانند نظر آتی تھیں۔ میرے کمرے میں تین کھڑکیاں تھیں درمیانی کھڑکی طول و عرض میں دروازے کے برابر تھی۔ باقی دو کھڑکیاں چھوٹی تھیں۔ ان کے کواڑوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ مالک مکان کا کبھی ارادہ تھا کہ ان میں شیشے جڑ لئے، پر اب ان کے بجائے ٹین کے ٹکڑے اور لکڑی کے موٹے موٹے ناہموار ٹکڑے جڑے تھے۔ کہیں کہیں لندن ٹائمز اور ٹربیون اخبار کے ٹکڑے بھی لگے ہوئے تھے۔ جن کا رنگ دھوئیں اور بارش کی وجہ سے خستہ بسکٹوں کی طرح بھوسلا ہو گیا تھا۔ یہ کھڑکیاں جن کی کنڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ بازار کی طرف کھلتی تھیں۔ اور ہمیشہ کھلی رہتی تھیں۔ اس لئے کہ ان کو بند کرنے کے لئے کافی وقت اور محنت کی ضرورت تھی۔

کھڑکیوں میں سے دور نظر ڈالنے پر پہاڑیوں کے بیچوں بیچ ٹیڑھی بنگی مانگ کی طرح "کشتواڑ" اور "بعد روا" جانے والی سڑک بل کھاتی ہوئی چلی گئی اور آخر میں آسمان کی نیلاہٹ میں مکمل مل گئی تھی۔

کمرے کا فرش خالص مٹی کا تھا جو کپڑوں کو چمٹ جاتی تھی اور دھوبی کی کوششوں کے باوجود اپنا گیر دا رنگ نہ چھوڑتی تھی۔ فرش پر پان کی پیک کے داغ جا بجا بکھرے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں کونوں میں بچی پڑی ہوئی ہڈیاں بھی پڑی رہتی تھیں جو ہر روز جھاڑو سے کسی نہ کسی طرح بچاؤ حاصل کر لیتی تھیں۔

اس کمرے کے ایک کونے میں میری چارپائی بچھی تھی جو بیک وقت میز، کرسی اور بستر کا کام دیتی تھی۔ اس کے ساتھ والی دیوار پر چند کیلیں ٹھکی ہوئی تھیں۔ ان پر میں نے اپنے کپڑے وغیرہ لٹکا دیئے تھے۔ دن میں پانچ چھ مرتبہ ان کو لٹکانا رہتا تھا۔ اس لئے کہ ہوا کی تیزی سے یہ اکثر گرتے رہتے تھے۔

کشمیر جانے یا وہاں سے آنے والے کئی مسافر اس کمرے میں ٹھہرے ہوں گے بعض نے آتے جاتے وقت تختوں پر چاک کی ڈلی یا پنسل سے کچھ نشانی کے طور پر لکھ دیا تھا۔ سامنے کھڑکی کے ساتھ والے تختے پر کسی صاحب نے یادداشت کے طور پر پنسل سے یہ عبارت لکھی ہوئی تھی ۲۵/۵/۴ سے دودھ شروع کیا اور ایک روپیہ پیشگی دیا گیا۔

اسی طرح ایک اور تختے پر یہ مندرج تھا:۔

دھوبی کو کل پندرہ کپڑے دیئے گئے تھے جن میں سے وہ دو کم لایا۔

میرے سرہانے کے قریب ایک تختے پر یہ شعر لکھا تھا۔

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں

خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اس کے نیچے "علیم بینیرٹ" لکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ نولیسندہ کا نام ہوگا یہی شعر کمرے کے ایک اور تختے پر لکھا تھا۔ مگر زرد چاک سے اس کے اوپر تاریخ بھی لکھ دی گئی تھی۔ ایک اور تختے پر یہ شعر مرقوم تھا ؎

میرے گھر آئے عنایت آپ نے مجھ پر یہ کی

میرے سر آنکھوں پہ آؤ تھی یکایک قسمت مری

اس سے دور ایک کونے میں یہ مصرعہ لکھا تھا۔

ایک ہی شب گو رہے لیکن گلوں میں ہم رہے

اس مصرعے کے پاس ہی اسی خط میں پنجابی کے یہ شعر مرقوم تھے ؎

تیرے بابہجر نہ سی قرار دل نوں، جذبہ پریم والا بے پناہ رہے گا

لکھ اکھیاں توں ہوئیں دور بھاویں ایہہ دلاں نوں دلاں دا راہ رہے گا

تیرے میرے پیار دا رب جانے، مگونالے دا نیر گواہ رہے گا

ترجمہ:۔ تیرے بغیر میرے دل کو کبھی قرار نہیں آئے گا۔ جذبہ محبت بے پناہ رہے گا تو لاکھ میری آنکھوں سے دور ہو۔ لیکن دل کو دل کی راہ رہے گی تیرے اور میرے پریم کو صرف خدا جانتا ہے۔ لیکن "مگونالہ" کا پانی بھی اس کا گواہ رہے گا۔

میں نے ان اشعار کو غور سے پڑھا۔ لیکن ایک بار نہیں کئی بار پڑھا۔

نہ معلوم اُن میں کیا جاذبیت تھی۔ کہ پڑھتے پڑھتے میں نے "ہیر" کی دلنواز دھن میں انہیں گانا شروع کر دیا۔ لفظوں کا روکھا پن لیں بالکل دور ہو گیا اور مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ لفظ پگھل کر اُس دھن میں حل ہو گئے ہیں۔

یہ شعر کسی خاص واقعہ کے تاثرات تھے۔ مگونالہ ہوٹل کے ایک میل کے فاصلہ پر شہتوتوں اور اخروٹ کے درختوں کے بیچوں بیچ بہتا تھا۔ میں یہاں کئی بار ہو آیا تھا۔ اس کے ٹھنڈے پانی میں غوطے لگا چکا تھا۔ اس کے ننھے ننھے پتھروں سے گھنٹوں کھیل چکا تھا لیکن یہ بانو کون تھی ؟

یہ بانو جس کا نام کشمیر کے بگوگوشے سی یاد تازہ کرتا تھا۔

میں نے اس بانو کو اس پہاڑی گاؤں میں ہر جگہ تلاش کیا مگر ناکام رہا اگر شاعر نے اس کی کوئی نشانی بتا دی ہوتی تو بہت ممکن ہے مگونالے ہی کے پاس اُس کی اور میری مڈبھیڑ ہو جاتی۔ اس مگونالے کے پاس جس کا پانی میرے بدن میں جھرجھری پیدا کر دیتا تھا۔

میں نے ہر جگہ بانو کو ڈھونڈا مگر وہ نہ ملی۔ اس موہوم جستجو میں اکثر اوقات مجھے اپنی بیوقوفی پر بہت ہنسی آئی۔ کیونکہ بہت ممکن تھا۔ کہ وہ اشعار سرے ہی سے مہمل ہوں اور کسی نوجوان شاعر نے اپنا من پرچانے کے لئے گھڑ دیئے ہوں۔ مگر خدا معلوم کیوں مجھے اس بات کا دلی یقین تھا کہ بانو —— وہ بانو جو آنکھوں سے دور ہونے پر بھی اس شاعر کے دل میں موجود ہے ضرور اس پہاڑی گاؤں میں سانس لے رہی ہے۔ سچ پوچھئے تو میرا یقین اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ بعض اوقات مجھے فضا میں اس کا تنفس گھلا ہوا

محسوس ہوتا تھا۔

نگونالے کے پتھروں پر بیٹھ کر میں نے اس کا انتظار کیا کہ شاید وہ اِدھر آ نکلے اور میں اسے پہچان جاؤں لیکن وہ نہ آئی۔ کئی لڑکیاں خوبصورت اور بدصورت میری نظروں سے گزریں مگر مجھے بانو جیسی دکھائی نہ دی۔ نگونالے کے ساتھ ساتھ اُگے ہوئے ناشپاتی کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں اخروٹ کے گھنے درختوں میں پرندوں کی نغمہ ریزیاں اور گیلی زمین پر سبز اور ریشمیں گھاس میرے دل و دماغ پر ایک خوشگوار سکان پیدا کر دیتی تھی اور میں بانو کے حسین تصوّر میں کھو جاتا تھا۔

ایک روز شام کو نگونالے کے ایک چوڑے چکلے پتھر پر لیٹا تھا خنک ہوا جنگلی بوٹیوں کی سوندھی خوشبو میں بسی ہوئی چل رہی تھی فضا کا ہر ذرّہ ایک عظیم الشان اور ناقابل بیان محبت میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آسمان پر اُڑتی ہوئی ابابیلیں زمین پر رہنے والوں کو گویا یہ پیغام دے رہی تھیں۔ اٹھو تم بھی ان بلندیوں میں پرواز کرو۔

میں نیچر کی سحر کاریوں کا لیٹے لیٹے تماشا کر رہا تھا۔ کہ مجھے اپنے پیچھے خشک ٹہنیوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے مڑ کر دیکھا۔ جھاڑیوں کے پیچھے کوئی بیٹھا خشک ٹہنیاں توڑ رہا تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور سلیپر پہن کر اُس طرف روانہ ہو گیا کہ دیکھوں کون ہے۔

ایک لڑکی تھی جو خشک لکڑیوں کا ایک گٹھا بنا کر باندھ رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ بھدی اور کن سری آواز میں ماہیا گا رہی تھی۔ میرے جی میں

آئی کہ آگے بڑھوں اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کے کہوں کہ خدا کے لئے د گاؤ۔ لکڑیوں کا گٹھا اٹھاؤ اور جاؤ مجھے اذیت پہنچ رہی ہے۔ لیکن مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہ ہوئی۔ کیونکہ اس نے خود بخود دگانا بند کر دیا۔

گٹھا اٹھانے کی خاطر جب وہ مڑی تو میں نے اسے دیکھا اور پہچان لیا یہ وہی لڑکی تھی جو بھٹیار خانے کے لئے ہر روز شام کو ایندھن لایا کرتی تھی معمولی شکل وصورت تھی۔ ہاتھ پاؤں بیحد غلیظ تھے۔ سر کے بالوں میں بھی کافی میل جم رہا تھا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور دیکھ کر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ میں جب اٹھ کر دیکھنے آیا تھا۔ تو دل میں آئی کہ چلو اس سے کچھ باتیں ہی کر لیں چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ یہ ایندھن جو تم نے اکٹھا کیا ہے! اس کا تمہیں جمّا کیا دے گا۔"

جمّا اس بھٹیار خانے کے مالک کا نام تھا۔

اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ "ایک آنہ"

"صرف ایک آنہ"

"کبھی کبھی پانچ پیسے بھی دے دیتا ہے۔

تو سارا دن محنت کر کے تم ایک آنہ یا پانچ پیسے کماتی"؟

اس نے گٹھے کی خشک لکڑیوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔ نہیں دن میں ایسے دو گٹھے تیار ہو جاتے ہیں۔"

"تو دو آنے ہو گئے"۔

"کافی ہیں"۔

"تمہاری عمر کیا ہے؟"

اس نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا "تم وہی ہو نا جو بھٹیار خانے کے اوپر رہتے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہاں وہی ہوں۔ تم مجھے کئی بار وہاں دیکھ چکی ہو"۔

"یہ تم نے کیسے جانا؟"

"اس لئے کہ میں نے تمہیں کئی بار دیکھا ہے"۔

"دیکھا ہو گا"۔

یہ کہہ کر وہ زمین پر بیٹھ کر گٹھا اٹھانے لگی۔ میں آگے بڑھا "ٹھہریں اٹھوا دیتا ہوں۔ گٹھا اٹھواتے ہوئے لکڑی کا ایک نوکیلا ٹکڑا اس زور سے میری انگلی میں چبھا کہ میں نے دونوں ہاتھ ہٹا لئے۔ وہ سر پر رسی کو الٹا کر گٹھے کو قریب اٹھا چکی تھی۔ میرے ہاتھ ہٹانے سے اس کا توازن قائم نہ رہا اور وہ لڑکھڑائی۔ میں فوراً اسے تھام لیا۔ ایسا کرتے ہوئے میرا ہاتھ اس کی کمر سے لے کر اٹھے ہوئے بازو کی بغل تک گھسیٹتا چلا گیا وہ تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ سر پر رسی کو اچھی طرح جمانے کے بعد اس نے میری طرف کچھ عجیب نظروں سے دیکھا اور چلی گئی۔

میری انگلی سے خون جاری تھا۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر اس پر باندھا اور رگو نالے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس پتھر پر بیٹھ کر میں نے

اپنی زخمی انگلی کو پانی سے دھو کر صاف کیا اور اس پر رومال باندھ کر سوچنے لگا۔ یہ بھی اچھی رہی بیٹھے بٹھائے اپنی انگلی لہو لہان کر لی ــــ خود ہی اٹھا لیتی۔ میں نے بھلا یہ تکلف کیوں کیا۔

یہاں سے میں اپنے ہوٹل، معاف کیجئے گا۔ بھٹیار خانے پہنچا اور کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دیر تک کھانا ہضم کرنے کی غرض سے کمرے میں ہی ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ پھر کچھ دیر تک لالٹین کی اندھی روشنی میں ایک واہیات کتاب پڑھتا رہا۔ سچ پوچھئے تو ارد گرد ہر شئے واہیات تھی۔ لال مٹی جو کپڑے کے ساتھ ایک دفعہ لگتی تھی تو دھوبی کے پاس جا کر بھی الگ نہ ہوتی تھی اور وہ آپس میں نہایت ہی بھونڈے طریقے پر جوڑے ہوئے تختے اور ان پر لکھے ہوئے غلط اشعار اور یہ مچوڑی ہوئی ہڈیاں جو ہر روز جھاڑو کی زد سے کسی نہ کسی طرح بچ کر میری چارپائی کے پاس نظر آتی تھیں۔

کتاب ایک طرف رکھ کر میں نے لالٹین کی طرف دیکھا۔ مجھے اس میں اور اس لکڑیاں چیننے والی میں ایک گونہ مماثلت نظر آئی۔ کیونکہ لالٹین کی چمنی کی طرح اس لڑکی کا لباس بھی پلید غلیظ تھا۔ مجھے اس کو بجھانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کیونکہ میں نے سوچا، تھوڑی ہی دیر میں دھوئیں کی وجہ سے یہ اس قدر اندھی ہو جائے گی کہ خود بخود اندھیرا ہو جائے گا۔

کھڑکیاں خود بخود بند ہو گئی تھیں۔ میں نے ان کو بھی نہ کھولا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ رات کے تو یا دس بج چکے تھے۔ سونے ہی والا تھا کہ بازار میں ایک کتا زور سے بھونکا جیسے اس کی پسلی میں یکایک درد اٹھ کھڑا ہوا ہے میں نے

دل ہی دل میں اس پر لعنتیں بھیجیں اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا مگر فوراً ہی نزدیک و دور سے کئی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں ایک عجیب و غریب سنگت قائم ہو گیا۔ اگر کوئی کتا ایک سُر چھیڑتا تو سنگت کے سارے سُر فضا میں گونجنے لگے۔ میری نیند حرام ہو گئی۔

دیر تک میں نے صبر کیا۔ لیکن مجھ سے نہ رہا گیا تو اٹھا دوسرے کمرے میں گیا اور اس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ نیچے بازار میں اترا اور جو پتھر میرے ہاتھ میں آیا مارنا شروع کر دیا۔ ایک دو پتھر کتوں کے لگے کیونکہ نہایت ہی مکروہ آوازیں بلند ہوئیں۔ میں نے اس کامیابی پر اور زیادہ پتھر پھینکنے شروع کئے۔ دفعتاً کسی انسان کے "اُف" کرنے کی آواز سنائی دی۔ میرا ہاتھ وہیں پتھر بن گیا۔

آواز کسی عورت کی تھی۔ سڑک کے دائیں ہاتھ ڈھلوان تھی۔ اُدھر تیز قدمی سے گیا تو میں نے دیکھا کہ نیچے ایک لڑکی دوہری ہو کر کراہ رہی تھی میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ کھڑی ہو گئی .... بدلی کے پیچھے چھپے ہوئے چاند کی دھندلی روشنی میں مجھے اپنے سامنے وہی اینڈھن چننے والی لڑکی نظر آئی۔ اس کے ماتھے سے خون نکل رہا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ میری غفلت کے باعث اُسے اتنی تکلیف ہوئی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ "مجھے معاف کر دینا...... لیکن تم یہاں کیا کر رہی تھیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں اوپر چڑھ رہی تھی"

"رات کو اس وقت تمہیں کیا کام تھا"

اس نے کرتے کی آستین سے ماتھے کا خون صاف کیا اور کہا "اپنے کتے شیرو کو ڈھونڈ رہی تھی"

بے اختیار مجھے ہنسی آگئی "اور میں تمام کتوں کا خون کر دینے کا تہیہ کر کے گھر سے نکلا تھا۔

وہ بھی ہنس دی۔

"کہاں ہے تمہارا شیرو؟"

اللہ جانے کہاں گیا ہے۔ یوں ہی سارا دن مارا مارا پھرتا ہے"

"تو اب کیسے تلاش کرو گی"

"یہیں سڑک پر مل جائے گا کہیں"

"میں بھی تمہارے ساتھ اسے تلاش کروں؟"

نیند میری آنکھوں سے بالکل اڑ چکی تھی اس لئے میں نے کہا کہ چلو کچھ دیر شغل رہے گا۔ لیکن اس نے سر ہلا کر کہا۔ نہیں میں اسے آپ ہی ڈھونڈ لوں گی۔ مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہو گا۔

"ابھی ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں"

"میرا خیال ہے کہ تمہارے مکان کے پچھواڑے ہو گا"

"تو چلو مجھے بھی ادھر ہی جانا ہے کیونکہ میں پچھلا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا"

ہم دونوں بھٹیار خانے کے پچھواڑے کی جانب روانہ ہوئے۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جو کبھی کبھی بدن پر خوشگوار کپکپی طاری کر دیتی تھی۔ چاند ابھی تک بادل کے پیچھے چھپا ہوا تھا روشنی تھی مگر بہت ہی دھندلی جو رات کی خنکی میں بڑی پُراسرار معلوم ہوتی تھی جی چاہتا تھا کہ آدمی کمبل اوڑھ کے لیٹ جائے اور اوٹ پٹانگ باتیں سوچے۔

سڑک طے کر کے ہم اُوپر چڑھے اور بھٹیار خانے کے عقب میں پہنچ گئے۔ وہ میرے آگے تھی۔ ایک دم وہ ٹھٹکی اور منہ پھیر کر عجیب و غریب لہجے میں اس نے کہا۔ ”دور دفان ہو نامراد؟“

ایک موٹا تازہ کتا نمودار ہوا اور اپنے ساتھ حلوائی کی کتیا کو گھسیٹتا ہوا ہمارے پاس سے گزر گیا۔

دروازہ کھلا تھا میں اسے اندر اپنے کمرے میں لے گیا لالٹین کی چمنی ابھی مکمل طور پر سیاہ نہیں ہوئی تھی۔ کیوں کہ ایک کونے سے جو اس کالک سے بچ گیا تھا۔ تھوڑی تھوڑی روشنی باہر نکل رہی تھی۔ دو ڈھائی گھنٹے کے بعد ہم باہر نکلے۔ چاند اب بادل سے نکل آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نیچے سڑک پر اس کا کتا شیر و بڑے سے پتھر کے پاس بیٹھا اپنا بدن صاف کر رہا ہے۔ اس سے کچھ دور حلوائی کی کتیا کھڑی تھی۔

جب وہ جانے لگی تو میں نے اُس سے پوچھا۔ تمہارا نام کیا ہے۔ اس نے جواب دیا۔

”بانو“

"بانو؟"..........

..........میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

اب اس نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "شیرو"

ایک مرد

پہلا منظر

زنانہ کالج کے ہوسٹل کا ایک کمرہ ——— مختصر ساز و سامان، لیکن ہر چیز سلیقے اور قرینے سے رکھی نظر آتی ہے۔ کمرے کے دو حصے ہیں ایک آگے دوسرا پیچھے بیچ میں دیوار ہے لیکن اس میں دو بڑے بڑے بغیر کواڑوں کے دروازے ہیں ان میں سے ایک سے کمرے کا دوسرا حصّہ نظر آتا ہے اور وہ کھڑکی بھی دکھائی دیتی ہے جو دوسری طرف میدان میں کھلتی ہے۔ کمرے کے دوسرے حصّے میں پلنگ بچھا ہے اس کے پاس تپائی رکھی ہے کھڑکی کے پاس آرام کرسی پڑی ہے۔ کمرے کے پچھلے حصّے یعنی پیش منظر میں سنتوش ایک کرسی پر بیٹھی اور دوسری کرسی پر ٹانگیں رکھے کتاب پڑھنے میں مصروف ہے ——— اس دروازے پر جو ہوسٹل کی غلام گردش کی طرف کھلتا ہے۔ دستک ہوتی ہے۔

سنتوش :- آجاؤ ——— دروازہ کھلا ہے۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ سنتوش کی سہیلی عذرا داخل ہوتی ہے)

عذرا :- کیا پڑھ رہی ہو ؟

سنتوش :- کچھ کہنا ہو تو فوراً کہہ دیا کرو ——— تمہیدیں نہ باندھا کرو ——— بولو کیا چاہتی ہو ؟

عذرا :۔ نوج تم سے کوئی بات کرے ــــــ ہر وقت منہ سُجائے بیٹھی رہتی ہو۔

سنتوش :۔ میں گھر سے یہاں پڑھنے آئی ہوں۔ تفریح کرنے نہیں آئی۔

عذرا :۔ جی !

سنتوش :۔ جی !!

عذرا :۔ جی ــــــ ایک صرف آپ ہی گھر سے یہاں پڑھنے آئی ہوں باقی سب تفریح کی غرض سے آئی ہیں ــــــ ایسی سڑی لسّی بات کرتی ہو کہ جی چاہتا ہے تم سے لڑنا شروع کر دوں ــــــ یہ تمہارے چہرے پر جو سنجیدگی اور متانت کا غلاف چڑھا رہتا ہے ایک ہی جھٹکے میں اُتار دوں۔

سنتوش :۔ تین برس گزر جانے پر بھی تمہارا یہ ارادہ مضبوط نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ؟

عذرا :۔ تمہارا سر ــــــ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ کیوں ہوتا ہے؟ وہ کیوں ہوتا ہے؟ ــــــ ہر بات میں قانون کی ایک ٹیک لگی رہتی ہے۔ وجہیں دریافت کی جا رہی ہیں۔ اسباب تلاش کیے جا رہے ہیں ــــــ جانے اُس شریف آدمی کا کیا حال ہو گا جو تم سے شادی کرنے کی حماقت کرے گا۔

سنتوش :۔ وہی جو احمقوں کا ہوتا ہے۔

عذرا :۔ سو وہ کوئی احمق ہی ہو گا جو تم سے شادی کرے گا ــــــ یہ میری بات اچھی طرح نوٹ کر لو ــــــ تم عقل مند ہو گئی ہو کہ کسی دوسرے کی عقل تم سے برداشت نہ ہو سکے گی۔

سنتوش :۔ عذرا دیکھو۔ میرا وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے یہ سارا چیپٹر زبانی یاد کرنا ہے جو کہنا ہے کہہ ڈالو اور جاؤ۔

(کرسی پر سے ٹانگیں ہٹا لیتی ہے۔ عذرا اس کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

عذرا :۔ توبہ ــــــ تم تو یہ چاہتی ہو کہ ادھر بٹن دباؤ اور اُدھر ساری بات نکل کر

باہر آجائے ـــــ یہ بھی مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ میں تو اپنی عادت کے مطابق آہستہ ہی سب کچھ بتاؤں گی۔ تم بیٹھی پروٹسٹ کرتی رہو۔

سنتوش :۔ لے اب جو کہنا ہے کہہ بھی ڈالو۔

عذرا :۔ ایک خط آیا ہے۔

سنتوش :۔ گھر سے ـــــ شادی وادی کی بابت ؟

عذرا :۔ نہیں ـــــ اباجی دوسری شادی کر کے مجھے تو بالکل بھول ہی گئے ہیں اب اگر میں انہیں لکھوں "بڑے اباجی میرا جی چاہتا ہے کہ لاماؤں کی سرزمین تبت میں چلی جاؤں اور وہاں کسی خانقاہ میں راہبہ بن جاؤں تو وہ یقیناً خوش ہو کر جواب دیں گے "بیٹا یہ تمہارا خیال بہت ہی مبارک ہے"

سنتوش :۔ رہنے بھی دو اس قدر نا امید نہیں ہونا چاہیئے ـــــ ہاں تو خط اگر گھر سے نہیں آیا تو کہاں سے آیا ہے ؟

عذرا :۔ جانے کہاں سے آیا ہے پتا درج ہی نہیں ـــــ لفافے پر میرا نام ہے لیکن خطاب ہوسٹل کی تمام لڑکیوں سے کیا گیا ہے ـــــ میں بھولی۔ صرف خوبصورت لڑکیوں کے نام۔

سنتوش :۔ لکھنے والا کون ہے ؟

عذرا :۔ ایک مرد۔

سنتوش :۔ بالغ یا نابالغ ؟

عذرا :۔ معلوم نہیں۔ لیکن تحریر سے کافی بلوغت ٹپکتی ہے۔

سنتوش :۔ نام ؟

عذرا :۔ وہی ایک مرد۔

سنتوش :۔ اور ہمارے ہوسٹل میں بارہ لڑکیاں ہیں۔

عذرا :۔ بارہ نہیں، تیرہ

سنتوش :۔ تیرہ کیسے

عذرا :۔ ایسے اتفاق سے تم بھی لڑکا ہو۔

سنتوش :۔ تو ایک مرد نے ہم تیرہ لڑکیوں کے نام یہ خط بھیجا ہے۔

عذرا :۔ غلط۔ صرف اُن کے نام جو اپنے آپ کو خوبصورت سمجھتی ہوں۔

سنتوش :۔ اس کا مطلب ؟

عذرا :۔ (اپنے بلاؤز میں سے ایک خط انگلیوں کی مدد سے نکالتی ہے) تم یہ خط پڑھ لو۔
(خط سنتوش کو دے کر باہر جانے لگتی ہے۔)

سنتوش :۔ تم کہاں چلیں ؟

عذرا :۔ صفیہ کو بلا لاؤں۔

سنتوش :۔ صفیہ حسن کو۔

عذرا :۔ نہیں دوسری صفیہ کو ــــ صفیہ حسن تو بیاہی ہوئی ہے۔ (وقفہ) سنتوش میں کہتی ہوں، ہوسٹلوں میں صرف بیاہی ہوئی عورتیں داخل کرنی چاہئیں۔

سنتوش :۔ کیوں ــ ؟

عذرا :۔ اس لئے کہ ہوسٹل ہسپتالوں سے زیادہ ملتے جلتے ہیں اور تم جانتی ہو کہ بیاہی ہوئی عورتیں اکثر بیمار رہتی ہیں (ہنستی ہے) اب ذرا تم بھی ہنس دو۔

سنتوش :۔ کسی کے کہنے پر میں کبھی نہیں ہنس سکتی۔

عذرا :۔ تو جہنم میں جاؤ ــ !

(چلی جاتی ہے)

سنتوش :۔ (خط پڑھتے ہوئے) ہاں ـ جاؤ، پر جلدی واپس آجانا ـ
(کچھ دیر تک سنتوش خط پڑھنے میں مصروف رہتی ہے)

ورشا:۔ (آواز باہر سے آتی ہے) میں اندر آسکتی ہوں۔

(ورشا اور عذرا دونوں اندر داخل ہوتی ہیں۔)

عذرا:۔ آؤ۔ آؤ۔ ورشا آؤ ۔۔۔ دیکھو تم یہاں بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔

ورشا:۔ کیا بات ہے؟ ۔۔۔ بڑی گھبرائی ہوئی ہو۔

(کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

عذرا:۔ سنتوش سے پوچھو ۔۔۔ وہ تمہیں سب کچھ بتا دے گی۔

(چلی جاتی ہے)

ورشا:۔ یہ خط بڑی دلچسپی سے پڑھا جا رہا ہے۔

سنتوش:۔ (سرگوشی میں دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے) عذرا گئی۔

ورشا:۔ گئی ۔۔۔ کیا بات ہے؟

سنتوش:۔ بتاتی ہوں ۔۔۔ مجھے ایک شرارت سوجھی ہے۔

ورشا:۔ شرارت؟

سنتوش:۔ ہاں! شرارت، عذرا اور دوسری لڑکیاں ہمیشہ شکایت کرتی تھیں کہ میں بہت سنجیدہ اور متین ہوں۔ سو کل بیٹھے بیٹھے مجھے ایک شرارت سوجھی ۔۔۔ کوئی سن تو نہیں رہا ہے ۔۔۔ ہاں تو میں نے ایک شرارت کی اور یہ خط لکھ کر عذرا کے نام ڈال دیا ۔۔۔ اب عذرا اس میں بڑی دلچسپی لے رہی ہے۔

میں تمہیں پوری بات سناتی پر کوئی آجائے گا ۔۔۔ یہ خط پڑھ لو (خط اس کے حوالے کرتی ہے ۔۔۔ اور اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

ورشا:۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔

سنتوش:۔ مجھے خود معلوم نہیں کہ خط لکھنے سے میرا مطلب کیا تھا۔ لیکن دیکھو ورشا کسی سے کہنا نہیں ورنہ سارا لطف جاتا رہے گا۔

درخشاں:۔ (خط پڑھتے ہوئے) یہ تمہیں کیا سوجھی؟

سنتوش:۔ دراصل درخشاں میں اپنی سنجیدگی اور متانت سے تنگ آ گئی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ اب کوئی ہنگامہ ہو۔

درخشاں:۔ (توقف کے بعد) ...... خط دلچسپ ہے

(غلام گردش سے تیز قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ اور فوراً ہی عذرا آٹھ دس، لڑکیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوتی ہے۔)

عذرا:۔ ہے نا ۔۔ میں ان سب سے ابھی ابھی یہی کہہ رہی تھی۔

عذرا:۔ (لڑکیوں سے) آجاؤ، سب کی سب اندر چلی آؤ ۔۔ اختری تمہارا یہ کھیلاپن مجھے اچھا نہیں لگتا ۔۔ چلی آؤ ۔۔ تمہیں اپنی ناک کی کیل سے جتنا پیار ہے اگر اتنا ہی مجھ سے ہوتا تو......

اختری:۔ تم ہر وقت میری اس کیل کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔

عذرا:۔ میں پوچھتی ہوں کہ بھلا کوئی یہ بھی زیوروں میں زیور ہے ۔۔ اچھی بھلی ناک میں کیل گاڑ دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ کیا تصویر کھنچاؤ گی۔

(کئی لڑکیاں ہنستی ہیں)

عذرا:۔ (ہنستے ہوئے) آؤ ۔ بھی آؤ ۔۔ مذاق برطرف ۔۔ اختری کی کیل سے یہ خط زیادہ اہم ہے۔

(کچھ لڑکیاں کھڑی رہتی ہیں کچھ کرسیوں اور میزوں پر بیٹھ جاتی ہیں)

درخشاں:۔ اہم وہم تو خاک بھی نہیں ۔۔ کوئی مرد ذرا سی بات کہہ دے تو تم اسے خواہ مخواہ اہمیت دینا شروع کر دیتی ہو ۔۔ جانے نگوڑا کون ہے۔ کون نہیں ہے۔

عذرا:۔ تو چھوڑو ۔۔ خط میرے حوالے کرو۔ اتنی دلچسپی سے پڑھ کیوں رہی ہو ۔۔

کتنی بھولی بنتی ہے۔ چہرے پر بالوں کی لٹیں ہر وقت یوں لٹکائے رکھتی ہے جیسے میری
بنو کو دنیا کا کچھ پتہ ہی نہیں —— لاؤ خط مجھے دو۔ (خط چھین لیتی ہے)

صفیہ :۔ (آگے بڑھ کر) ...... یہ تم دونوں نے لڑنا کیوں شروع کر دیا۔ یہاں بلایا
ہے تو کچھ ہمارے پلے بھی پڑے۔

عزّت :۔ تم اب اپنا جھگڑنا بند کر دو —— توبہ، چلتی ہے تو معلوم ہوتا ہے، توڑے
لے رہی ہے —— چلو اب خط سناؤ۔

عذرا :۔ تمہیں سننے کی کیا ضرورت ہے ۔ اس عینک میں سے تم لفافوں کے اندر کا
مضمون بھی پڑھ لیا کرتی ہو۔

(بہت سی لڑکیوں کا شور —— خط سنایا جائے ۔ خط سنایا جائے)

عذرا :۔ (تقریر کے انداز میں) ...... خاموش —— خاموش —— ورشام سنتوش
سے کیا کھسر پھسر کر رہی ہو؟ خاموش رہو —— ہاں تو، میں نے تمہیں سنتوش کے
کمرے میں اس لئے بلایا ہے کہ مجھے آج ایک مرد کی طرف سے یہ خط وصول ہوا ہے۔

عزّت :۔ (خوش ہو کر) ...... ایک مرد کی طرف سے!

نرملا :۔ اتنی خوش کیوں ہوتی ہو؟

عذرا : خاموش —— اس میں خوشی کی کوئی بات نہیں —— جو خط وصول ہوا ہے
میں آپ کو سنا دیتی ہوں خوشی اور غمی کا فیصلہ بعد میں کیا جائے! سرلا اور بملا
تم دونوں بہنیں مجھے یوں گھور گھور کے کیوں دیکھ رہی ہو؟

سرلا اور بملا :۔ (دونوں) نہیں تو۔

عزّت :۔ عذرا ۔ تم خط سناؤ۔

عذرا :۔ لو سنو —— (خط کا کاغذ کھولتی ہے) ...... ہوسٹل کی تمام خوبصورت
لڑکیو ...... (لڑکیوں کی سرگوشیاں)

عذرا:۔ رشیدہ تم غور سے سنو.... ہوسٹل کی تمام خوبصورت لڑکیو....

(اضطراب کی آوازیں)

عذرا:۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟

خورشید:۔ رشیدہ کہتی ہے ۔ میں اب یہاں نہیں بیٹھوں گی۔

سنتوش:۔ عذرا تم نے اسے کیوں چھیڑا — کیا ہے ۔ بیچاری کی شکل میں — تم سے تو لاکھ درجے اچھی ہے۔

صفیہ:۔ تم خط سناؤ جی۔ یہ بیکار کی باتیں کیا لے بیٹھی ہو۔

عذرا:۔ ہوسٹل کی تمام خوبصورت لڑکیو — میری دعا ہے کہ شادی کے بعد بھی تمہاری خوبصورتی برقرار رہے۔

عزت:۔ آدمی شریف معلوم ہوتا ہے۔

(چند لڑکیاں ہنستی ہیں)

عذرا:۔ تم ضرور لفظ شادی سے گھبراؤ گی۔ تم میں سے بعض میں یہ گھبراہٹ اصلی ہو گی اور بعض میں مصنوعی۔ مرد مصنوعی اور اصلی گھبراہٹ پسند کرتے ہیں — ضرور گھبراؤ — لیکن کاش تم شادی کے بعد بھی گھبرا سکتیں۔

اختری:۔ ہے ہے — یہ نگوڑا کس قسم کا آدمی ہے — کیا اوٹ پٹانگ لکھا ہے۔ گھبراؤ — ضرور گھبراؤ۔

خورشید:۔ گھبرائے تمہاری بلا — تم تو اس دن کے انتظار میں....

اختری:۔ چپ کر موئی زبان دراز۔

عذرا:۔ خاموش.... ہاں تو آگے لکھا ہے.... یہ خط میں صرف خوبصورت لڑکیوں کو لکھ رہا ہوں۔

(سرگوشیاں)

صفیہ :- کیوں خوبصورت لڑکیاں کیا اس مردودے کی خالہ کی بھتیجی لگی ہیں۔

اختری :- تم کیوں چڑتی ہو؟

عذرا :- (خط پڑھتے ہوئے) یہ خط میں صرف خوبصورت لڑکیوں کو لکھ رہا ہوں۔ اس کا جواب اگر مجھ سے طلب کیا جائے تو میں کہوں گا۔

سورن لتا :- کیا کہے گا؟

عذرا :- کہ عورت میں جیسے دنیا میں بڑے بڑے کام سرانجام دینا ہوتے ہیں خوبصورتی کا ہونا اشد ضروری ہے۔ اگر عورت خوبصورت نہیں تو وہ ایسا کمرہ ہے جس میں کوئی روشندان نہ ہو۔

سرلا :- آگے کیا لکھا ہے؟

صفیہ :- آگے کیا لکھا ہے تمہارا سر —— ذرا اس کی طرف دیکھو۔ اختری کتنی دلچسپی لے رہی ہے۔ وہ موا گالیاں دے رہا ہے ہمیں —— اور یہ مزے سے سن رہی ہے۔

عذرا :- خوبصورتی ازدواجی زندگی کے تنفس کے لئے اشد ضروری ہے یہ خط پڑھنے کے بعد تم میں سے اکثر اپنے آپ سے سوال کریں گی "کیا میں خوبصورت ہوں؟"

اختری :- صفیہ تو ضرور کرے گی۔

صفیہ :- پہلے میں اس یوسف کو نہ دیکھوں گی جو لوگوں کی خوبصورتی ماپتا پھرتا ہے۔

(تین چار لڑکیوں کی ہنسی)

عذرا :- تم میں سے اکثر بے وقوف لڑکیاں آئینے کی گواہی طلب کریں گی۔

صفیہ :- (غصے میں اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

عذرا :- اس سے کہو کہ منہ سنبھال کر بولے۔

(عذرا اور تین چار لڑکیوں کی ہنسی)

ستنوش :۔ آرڈر ——— آرڈر۔

عذرا :۔ (خط پڑھتے ہوئے) اپنے حافظے پر زور دے کر ایسے واقعات تلاش کریں گی جنھوں نے کبھی ان کی خوبصورتی یا بدصورتی کا فیصلہ کیا ہوگا ——— سچ پوچھو تو عورت اپنی خوبصورتی یا بدصورتی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی ——— اس کی خوبصورتی یا بدصورتی کا فیصلہ کرنے والے ہم ہیں یعنی مرد۔

صفیہ :۔ گدھے کہیں کے۔

ستنوش :۔ تم بہت جلد بگڑ جاتی ہو۔

درخشا :۔ (ہنس کر) اس قدر غصہ۔

صفیہ :۔ غصہ کیوں نہ آئے ——— بات ہی ایسی ہے ——— نامعقول کہیں کا ——— خیر بتاؤ آگے کیا لکھا ہے؟

عذرا :۔ تمہارے گالوں پر زخم کا نشان جو بظاہر بدصورت معلوم ہوتا ہے۔ کسی مرد کی نگاہوں میں تمہاری خوبصورتی کا باعث ہو سکتا ہے (صفیہ اپنے گال کے داغ کو چھپا لیتی ہے) تمہارا توتلاپن تمہارا ابھرا ہوا سا لنگڑا کر چلنا۔ تمہارا ضرورت سے زیادہ بھولاپن جس سے شاید تمہارے ماں باپ نالاں ہوں۔ تمہارا ٹوٹا ہوا دانت تمہاری شکن آلود پیشانی، تمہارے موٹے ہونٹ جن کی بدصورتی کے متعلق دل ہی دل میں تم نے کئی بار سوچا ہوگا۔ تمہیں خوبصورت بنانے میں بیش از بیش حصہ لے سکتے ہیں۔

رشیدہ :۔ (طنز کے ساتھ) تمہارے مڑے ہوئے دانت تمہاری تنگ پیشانی تمہارا اکتا ہوا بازو۔ تمہاری پھولی ہوئی توند۔ تمہاری گاجر برابر چوٹی اور تمہارے سوجے ہوئے ہاتھ۔ تمہیں خوبصورت بنانے میں بیش از بیش حصہ لے سکتے ہیں ——— مجھے تو یہ کوئی سڑی دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔

عذرا :۔ آگے سنو۔ ہم آرٹسٹ ہیں یہی وجہ ہے کہ قدرت نے تمہیں صرف ہمارے

پاس بھیجا ہے کہ ہم تمہاری نوک پلک نکالیں تمہیں خوبصورت بنائیں تمہارے اندر یہ احساس پیدا کریں کہ تم خوبصورت ہو۔ اگر ہم نہ ہوتے تو بہت ممکن ہے چاند اور تارے تم پر بازی لے جاتے مگر چونکہ ہم ہیں۔ اس لئے آسمانوں اور زمینوں کی تمام خوبصورتیاں نوچ کر ہم نے تمہارے قدموں میں ڈال رکھی ہیں۔

صفیہ:۔ محض بکواس ہے۔

نرملا:۔ خاموش بھی رہو۔

سرلا:۔ اس کی ٹلو تو بس چلتی رہتی ہے۔

عذرا:۔ تم اس ہوسٹل کی چار دیواری میں قید ہو۔ فلسفے۔ ہندسے اور معاشیات کی یہ موٹی موٹی کتابیں رٹتی رہتی ہو، تم میں سے کچھ فلسفے کی تیز شیشوں والی عینک ہر وقت اپنی ناک پر چڑھائے رکھتی ہیں —— میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ فلسفہ محض ڈھکوسلہ ہے زبان و مکاں کی بحث بالکل لایعنی ہے۔ معاشیات کے اصول کسی کام کے نہیں —— دنیا کے نظام پر صرف ایک چیز حکومت کرتی ہے صرف ایک چیز اور وہ عورت اور مرد کی ازلی دوستی ہے۔

اختری:۔ بے خودی کے عالم میں ازلی دوستی ہے۔

عذرا:۔ تم مردوں سے دور کیوں رہتی ہو؟ —— نہیں دور ہی رہو۔ اس لئے کہ تم دور رہنے پر زیادہ قریب آجاتی ہو۔ تم دور رہ کر خود کو قریب محسوس نہ کیا کرو اس لئے کہ تمہارا یہ احساس اس قربت کا سارا لطف خراب کر دیتا ہے اس احساس سے صرف مرد ہی لطف اندوز ہوں تو اچھا ہے۔

صفیہ:۔ دوری اور نزدیکی کا یہ گورکھ دھندا خوبصورت ہے۔

عذرا:۔ (شاعرانہ انداز میں) ۔۔۔ رات کو سوتے وقت جب تمہارے کنوارے دماغ فلسفے معاشیات اور جبر و مقابلہ کی دھندے سے آزاد ہوں تو اپنے

کمرہ کی لطیف فضا میں جو تمہارے وجود سے اور بھی لطیف ہو جاتی ہے کچھ دیر کے لئے سوچا کہ مرد کیا ہے —— جب صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کالج جانے کے لئے زبردستی تمہاری مُندی ہوئی آنکھیں کھول جائیں گی اور تمہارا دل و دماغ نیند کی دھنکی ہوئی روئی میں لپٹا ہوگا تو اس وقت بھی نیم غنودگی کی حالت میں سوچنا کہ مرد کیا ہے (خورشید انگڑائی لیتی ہے) ..... اندھیری یا چاندنی راتوں میں جب تمہیں ہر شے پُراسرار دکھائی دے گی اور ایک بے نام سا اضمحلال تم پر طاری ہوگا۔ اس وقت بھی تم اپنے نرم سیر دماغ سے پوچھنا "مرد کیا ہے"۔

عزت :۔ (بے خود ہو کر تالی بجاتی ہے) بہت خوب۔ بہت خوب۔

ورشا :۔ سنتوش بھئی کچھ بھی ہو —— فقرہ بہت خوبصورت —— اندھیری یا چاندنی راتوں میں جب ہر شے پُراسرار دکھائی دے گی اور ایک بے نام سا اضمحلال تم پر طاری ہوگا۔ اس وقت بھی اپنے نرم سیر دماغ سے پوچھنا "مرد کیا ہے ؟" —— بہت اچھا فقرہ ہے۔

سنتوش :۔ آہستہ ورشا —— چپ۔

عذرا :۔ ہوسٹل کی خوبصورت لڑکیو —— وہ جو پھولوں میں نت نئے رنگ بھرتا ہے وہی تمہاری جوانیوں میں رنگ بھرے —— اگر تم اس خط کا جواب دینا چاہو تو لکھ کر اس بڑے پتھر کے نیچے رکھ دینا جو تمہارے ہوسٹل کی عمارت میں کام نہیں آسکا تھا۔ اور جواب باہر سڑک کے پاس بیکار پڑا ہے ——

راقم —— ایک مرد

سرلا :۔ (افسوس کے ساتھ) ختم ہو گیا۔

صفیہ :۔ کیا کوئی ناول پڑھ کے سنایا جا رہا تھا تمہیں۔

عذرا :۔ خاموش —— بہنو خط آپ نے سن لیا۔ اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

سنتوش تمہاری کیا رائے ہے ؟

بہت سی لڑکیاں :۔ ہاں پہلے سنتوش اپنی رائے ظاہر کرے۔

سنتوش :۔ رائے ؟ ۔ میں ــــ میں کیا رائے دوں ــــ تم جو فیصلہ کروگی مجھے منظور ہوگا۔

عزّت :۔ عذرا ــــ میری رائے میں اس خط کا جواب ضرور دینا چاہیئے۔ اندھیری یا چاندنی راتوں میں صبح اٹھتے وقت یا رات سوتے وقت اپنے آپ سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ مرد کیا ہے ــــ میں سب جانتی ہوں کہ مرد کیا ہے ؟

عذرا :۔ بتاؤ مرد کیا ہے ؟

عزّت :۔ مرد وہ جانور ہے جو کان رکھنے پر بھی دودھ نہیں دیتا جیسا چمگادڑ۔

صفیہ حسن :۔ مجھے تمہارا یہ مذاق پسند نہیں آیا۔

عزّت :۔ اس لئے کہ تم اس قسم کی ایک چمگادڑ سے بیاہی ہو۔

(چند لڑکیاں ہنستی ہیں)

بملا :۔ میرا اور سرلا کا خیال ہے کہ اس خط کا جواب ایسی ہی میٹھی زبان میں دینا چاہیئے۔

اختری :۔ تو اتنی شکر تم دونوں بہنوں کی زبان میں ہے۔

عذرا :۔ کمل تم خمیرے آٹے کی طرح پھیلی ہوئی کیا سوچ رہی ہو ؟ کچھ تم بھی بولو

کمل :۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔

عزّت :۔ اسپرین کھاؤ۔

عذرا:۔ (خورشید کے پاس جاکر) خورشید تم ان معاملوں میں بڑی ماہر ہو۔
بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہئیے۔

خورشید:۔ (تنگ کر) مجھے یہ چھیڑ خانی اچھی نہیں لگتی عذرا ــــ (لہجہ بدل کر اختری سے) خدا کی قسم جب سے اس نے یہ خط سنایا ہے۔ میرا دل ڈر کے مارے دھک دھک کر رہا ہے ــــ مجھے بڑی دہشت ہوتی ہے ایسی باتوں سے۔

اختری:۔ (مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ) میں تم سے کئی بار کہہ چکی ہوں کہ اپنے دل کا علاج کراؤ ــــ ایسا نہ ہو کہ شادی کے روز مارے دہشت کے دل بند ہو جائے۔

(تین چار لڑکیوں کی ہنسی)

عذرا:۔ نرملا تمہارا کیا خیال ہے؟

نرملا:۔ میں اس معاملہ میں اپنی رائے محفوظ رکھنا چاہتی ہوں۔

عزت:۔ رفیعہ بجر بڑھ میں رکھ چھوڑو۔

(چند لڑکیاں ہنستی ہیں)

عذرا:۔ ورشا ــــ میری بھولی بھالی ورشا تمہارا کیا خیال ہے؟

ورشا:۔ میرا خیال ہے کہ صفیہ سے پوچھا جائے۔

عذرا:۔ بولو صفیہ تمہاری کیا رائے ہے؟

صفیہ:۔ تم کہو گی کہ مجھے مردوں سے خدا واسطے کا بیر ہے مگر سچ پوچھو تو اس خدا واسطے کے بیر کے بغیر کام بھی نہیں چل سکتا۔ میری رائے ہے کہ

ہم سب مل کر ایک محاذ بنالیں۔ اس مرد کا کھوج لگائیں۔ جب کھوج لگ جائے تو سب مل کر اس پر حملہ کر دیں ـــــ اگر آدمی اتفاق سے شریف نکل آیا تو ہم اسے معاف کر دیں گے ـــــ معاف کر دینے میں اور ہی لطف ہے۔

عذرا:۔ تمہارا مطلب ہے کہ ہم اُسے ماریں؟

صفیہ:۔ یقیناً یہی میرا مطلب ہے۔

سرلا اور بملا:۔ (دونوں بیک زبان) یہ صریحاً ظلم ہے۔

عزت:۔ مجھے بھی اس سے اتفاق نہیں ـــــ ممکن ہے بیچارے کے کہیں چوٹ آ جائے۔ تو تو بالکل ڈائن قصائن ہے۔

صفیہ:۔ میں نے اپنی رائے ظاہر کر دی ہے۔ ماننا نہ ماننا تمہارا اختیار ہے عذرا تمہارا کیا خیال ہے؟

سرلا:۔ ہاں عذرا سے پوچھو اس کا کیا خیال ہے؟

عذرا:۔ تم سب کی رائے طلب کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ خط کا جواب نہیں دینا چاہیئے۔ لیکن دینا بھی چاہیئے۔ اس لئے کہ یہ ضروری ہے۔ سو اس کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ یہی خط اس پتھر کے نیچے رکھ دیا جائے ـــــ کیا خیال ہے تمہارا عزت ـــــ میں سمجھتی ہوں کہ یہ طریقہ سب سے بہتر رہے گا۔

یعنی اس میں کوئی قطعی جواب نہیں ہے ہاں بھی ہے اور نہیں بھی۔

عزت:۔ تمہارا خیال درست ہے۔

عذرا:۔ جنہیں یہ بات پسند ہے وہ اپنا ہاتھ کھڑا کر دیں۔

(چند لمحات سرگوشیاں ہوتی ہیں پھر سب لڑکیاں اپنا اپنا ہاتھ کھڑا کر دیتی ہیں)

عذرا:۔ سب راضی ہیں ـــ سنتوش ـــ تم نے ہاتھ کھڑا نہیں کیا؟

سنتوش:۔ میں سمجھتی تھی کہ میں نے کر دیا ہوگا ـــ لو ـــ

(ہاتھ کھڑا کر دیتی ہے)

عذرا:۔ تو یہ طے ہے ـــ میرا پہلا پیریڈ خالی ہے میں ابھی جا کر یہ خط اس پتھر کے نیچے رکھ دیتی ہوں۔

سرلا:۔ لیکن شام کے چھ بجے پھر جا کے دیکھنا۔ ممکن ہے کوئی نئی بات . . .

(گھنٹے کی آواز)

بہت سی لڑکیاں:۔ چلو ـــ چلو ـــ اب بھاگو ـــ

(لڑکیاں دروازے کی طرف بھاگتی ہیں۔ صرف درشا اور سنتوش کمرے میں رہ جاتی ہیں)

سنتوش:۔ (جب ساری لڑکیاں باہر چلی جاتی ہیں تو آہستہ سے) درشا۔ اب کیا ہوگا!

درشا:۔ (ہنس کر) کیا ہوگا ـــ کچھ بھی نہیں ہوگا ـــ مجھے تو تمہاری اس شرارت میں کچھ مزا نہیں آیا۔

سنتوش:۔ عذرا اس پتھر کے نیچے خط رکھ آئے گی۔

درشا:۔ تم ایک گھنٹہ بعد وہاں جا کر نکال لینا ـــ اس میں گھبرانے کی بات

ہی کیا ہے ؟ — چلو اب چلیں۔

سنتوش :۔ چلو!

(دونوں چلی جاتی ہیں)

دوسرا منظر

(ہاسٹل کا وہی کمرہ جو ہم پہلے منظر میں دکھا چکے ہیں۔ کلاک چھ بجاتا ہے۔ آہستہ آہستہ پردہ اٹھتا ہے اور سنتوش اضطراب کے ساتھ ٹہلتی دکھائی دیتی ہے۔ چند لمحات کے بعد ایک دم دروازہ کھلتا ہے)

سنتوش :۔ پلٹ کر کون ؟

(ورشا اندر داخل ہوتی ہے)

ورشا :۔ کیا بات ہے اس قدر پریشان کیوں ہو؟ خط لے آئی ہو وہاں سے؟

سنتوش :۔ لے آئی ہوں — لو پڑھ لو۔

ورشا :۔ صبح پڑھ تو لیا تھا۔

سنتوش :۔ نہیں یہ دوسرا ہے۔

ورشا :۔ کیا کوئی اور لکھا ہے ؟

سنتوش :۔ یہ سچ مچ کسی مرد کا لکھا ہوا ہے۔

ورشا :۔ ہائیں یہ کیا ہوا ؟

سنتوش :۔ کیا معلوم — میں وہاں گئی تو پتھر کے نیچے میرے خط کے بجائے یہ کاغذ پڑا تھا۔

(زیبا خط ورشا کو دیتی ہے)

ورشا:۔ خط لے کر بیٹھ جاتی ہے) ...... اُس عورت کے نام جس نے ایک مرد کی دلی کیفیات بڑی کامیابی سے بیان کیں (سنتوش سے) تو وہ بھانپ گیا۔

سنتوش:۔ ظاہر ہے۔

(پھر اضطراب کے ساتھ ٹہلنا شروع کر دیتی ہے)

ورشا:۔ کیا لکھا ہے؟ (پڑھتے ہوئے) اتفاق ہاں اتفاق سے تمہارا لکھا ہوا خط جو دل سے کم نازک نہیں۔ پتھر کے نیچے دبا ہوا ملا۔ میں نے اُس کو نکالا اور پڑھا۔

سنتوش:۔ آہستہ پڑھو!

ورشا:۔ وہ مرد یقیناً خوش قسمت ہو گا جسے تمہاری رفاقت نصیب ہو گی۔ —— اگر میں عورت ہوتا اور یہ خط واقعی کسی مرد کی جانب سے مجھے ملتا تو کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ میں کیا کرتا؟ (اپنی طرف سے) "کوئی ضرورت نہیں" (پھر خط پڑھتی ہے) تمہارے خط کا ایک ایک لفظ ایک ایک پنکھڑی ہے جو مجھے تمہارے ہی سانس کے زیر و بم سے لرزاں نظر آئی —— آدمی شاعر معلوم ہوتا ہے۔

سنتوش:۔ آگے پڑھو!

ورشا:۔ میں پہلے عورت کو ایک حل نہ ہو سکنے والا معمّا سمجھتا تھا۔ مگر تمہارے اس خط نے یہ مشکل آسان کر دی ہے۔ تمہارا خط۔ خط نہیں بلکہ عورت

کی وہ انگڑائی ہے۔ جس کے کھلاڑ نے نسوانیت کے سارے خطوط میرے سامنے نمایاں کر دیئے ہیں۔ میں خوبصورت نہیں —— اس بات کا احساس مجھے ہمیشہ دکھ دیا کرتا تھا پر اب تمہارا خط پڑھ کر مجھے ڈھارس ہوئی ہے کہ مجھے خوبصورت بنانے والی کوئی نہ کوئی ہستی اس دنیا میں ضرور موجود ہے اور وہ ہستی عورت کے سوا اور کون ہو سکتی ہے؟ —— میں اس خط کا جواب نہیں چاہتا اس لئے کہ وہ بھی اس پتھر کے نیچے رکھ دیا جائے گا —— راقم

ایک مرد

سنتوش :- ادھر کونے پر کچھ اور بھی لکھا ہے (ورشا کو خط کا کونہ دکھاتی ہے)

ورشا :- (پڑھتی ہے) میں اپنے آپ کو چھپانا نہیں چاہتا۔ تم مجھے چھ بجے کے بعد پتھر کے آس پاس ٹہلتا دیکھ لوگی —— چھ تو بج چکے ہیں اور تمہاری اس کھڑکی میں سے تو سب کچھ نظر آتا ہے۔

وہ —— وہ پتھر پڑا ہے۔

(کھڑکی میں سے باہر کوئی نظر نہیں آتا)

سنتوش :- آہستہ بولو کوئی سن لے گا۔

ورشا :- اگر اتنا ڈر تھا تو یہ خط وہاں سے اٹھایا ہی نہ ہوتا۔

سنتوش :- اٹھا لیا تو بعد میں خیال آیا۔

ورشا :- تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ خط کون لکھ سکتا ہے؟

(اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور کھڑکی کی طرف دیکھتی ہے)

سنتوش :- کچھ سمجھ میں نہیں آتا —— زیادہ حیران کرنے والی بات تو یہ

ہے کہ اس پتھر کے نیچے اس کا ہاتھ کیسے پہنچ گیا — کیسی کیسی جگہ اِن لوگوں کا ہاتھ پہنچ جاتا ہے۔

ورشا :۔ خدا اچھا ہے۔

سنتوش :۔ ہاں بُرا نہیں — پر ورشا کسی سے کہیو مت — اور دیکھو میں کیا کہہ رہی تھی — ہاں تو ایسا نہ کریں کہ اس پتھر ہی کو یہاں سے اُٹھوا دیں؟

ورشا :۔ اس سے کیا ہوگا؟

سنتوش :۔ ٹھیک ہے اس سے کیا ہو سکتا ہے؟ — ورشا!

ورشا :۔ کیا؟

سنتوش :۔ اب کیا ہوگا — میرا خط اس کے پاس ہے۔

ورشا :۔ اور اس کا تمہارے پاس۔

سنتوش :۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ — میں چاہتی ہوں کہ میرا خط مجھے واپس مل جائے — ورشا — دیکھو — اِدھر دیکھو۔ کھڑکی میں سے دور ایک مرد دکھائی دیتا ہے۔

ورشا :۔ ہاں، ہاں ایک مرد۔ شاید وہی۔

(ورشا کمرے کے دوسرے حصے کی طرف جانا چاہتی ہے)

سنتوش :۔ کھڑکی کے پاس مت جاؤ۔ یہیں سے دیکھو (اُسے روک لیتی ہے اور آپ اُدھر کا رخ کرتی ہے)

ورشا :۔ مجھے روکتی ہو اور آپ جا رہی ہو۔

سنتوش: نہیں تو —— لو میں بیٹھ جاتی ہوں۔ اُدھر سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن نظریں کھڑکی کی طرف لگی رہتی ہیں —— ورشا اچھی طرح سے نظر نہیں آتا۔

ورشا:۔ تمہاری نظر کمزور ہے۔

سنتوش:۔ (اپنے آپ پر جھنجھلا کر) عینک نہ جانے کب لگواؤں گی؟

ورشا:۔ صاف نظر آتا ہے یہاں سے۔

سنتوش:۔ (اُٹھ کر اشتیاق بھرے لہجہ میں) کیسا؟

ورشا:۔ ٹھہرو! مجھے اچھی طرح دیکھ لینے دو —— ہیٹ پہنے ہے۔

سنتوش:۔ یہ تو میں بھی دیکھ سکتی ہوں۔

ورشا:۔ ہیٹ پہنے ہے، قد چھوٹا ہے۔

سنتوش:۔ نہیں ورشا، اتنا چھوٹا نہیں۔

ورشا:۔ بھئی —— میں تو اسے چھوٹا ہی کہوں گی۔ عورتوں کے لئے اتنا قد ٹھیک ہے۔ پر مرد تو کچھ اونچے ہی ہونے چاہئیں۔

سنتوش:۔ اتنی دھوپ میں کھڑا ہے۔

ورشا:۔ پیٹھ ہماری طرف ہے۔

سنتوش:۔ ہاں سوچنے کی بات ہے —— اِدھر منہ کیوں نہیں کرتا۔

ورشا:۔ اُسے کیا معلوم کہ تمہارا کمرہ اس طرف ہے۔

سنتوش:۔ ٹھیک ہے —— پر ہوسٹل کی عمارت تو ادھر ہے۔ اُسے اِدھر ہی دیکھنا چاہیئے۔

ورشا:۔ ممکن ہے شرماتا ہو۔
سنتوش:۔ ورشا، اُسے یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔
ورشا:۔ کیوں ؟
سنتوش:۔ بڑی بدنامی کی بات ہے ـــــ اگر کسی کو پتہ لگ جائے تو۔۔
۔۔۔ بھئی میرا دل دھک دھک کر رہا ہے (ورشا کا ہاتھ اٹھا کر اپنے
دل پر رکھتی ہے)
ورشا:۔ اس کو نہ دیکھو کھڑکی بند کر دو۔
سنتوش:۔ یہ بھی تو نہیں کر سکتی ـــــ ہوا ـــــ ہوا ـــــ ہوا ـــــ
بند ہو جائے گی۔
ورشا:۔ (شرارت کے ساتھ) ہاں ٹھیک کہتی ہو ـــــ سانس لینا
دشوار ہو جائے گا۔
سنتوش:۔ کب اِدھر منہ کرے گا ـــــ ورشا تم بھی مجھے کچھ نہیں بتاتی ہو
(مرد اسی طرح بیٹھ گئے کھڑا رہتا ہے ـــــ دروازے ہی سے پیچھے
سے عذرا اندر داخل ہو کر سنتوش اور ورشا کے پیچھے کھڑی
ہو جاتی ہے)
ورشا:۔ کیا بتاؤں تمہیں۔
عذرا:۔ (یک دم)۔۔۔ یہ بتاؤ اس کا رنگ کیسا ہے ؟ دفعتاً سنتوش اور
ورشا دونوں چونکتی ہیں۔ اور کہتی ہیں کون ـــــ عذرا۔۔۔۔ ناک نقشہ
کیسا ہے۔ ٹھوڑی کیسی ؟ ہونٹ کیسے ہیں۔ لباس کیسا ہے طبیعت کیسی

ہے۔ تو یہ سب باتیں کوئی تجھ سے پوچھے۔

سنتوش :۔ (کھسیانی ہنسی) . . . کہ ــــ کہ ــــ کہ کیسی باتیں؟

عذرا :۔ یہی معصوم باتیں کہ وہ کیسا ہے۔ کیا کرتا ہے ــــ بھئی ایسی باتیں معلوم کرنی ہی پڑتی ہیں۔

سنتوش :۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔ (ایک طرف ہٹ جاتی ہے)

عذرا :۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟

سنتوش :۔ جانے کیا اوٹ پٹانگ بکتی ہو۔

عذرا :۔ ایسے متے کسی اور کو دو ــــ خط لکھ کر مقررہ وقت پر جب کوئی مرد بڑے بڑے پتھروں کے پاس ٹہلتا ہو تو کیسے معلوم نہیں ہو جاتا کہ بات پگھلنے والے موم کی ہے (ہنسی ہے) گھبرا کیوں گئیں؟

سنتوش :۔ (گھبرا کر) کیسا خط ــــ پتھر ــــ کونسا پتھر ــــ میں ــــ میں، کہاں ہے وہ مرد؟ ــــ دیکھ لو ــــ (مرد ایک طرف ہٹ جاتا ہے اور نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے)

عذرا :۔ تمہاری کھڑکی کے پاس چلا آئے گا گھبراتی کیوں ہو ــــ میری بھولی بھالی درشا تمہارا کیا خیال ہے؟

درشا :۔ تم جانو اور یہ جانے، بھئی مجھے کچھ پتہ نہیں۔
دیوار پر لگی ہوئی تصویر دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔

عذرا :۔ تمہاری مرضی۔
(کھڑکی پر دستک ہوتی ہے)

عذرا :- لو وہ آگیا ۔

سنتوش :- (سخت گھبرا کر) اب میں کیا کروں — عذرا پرماتما کے لئے کچھ کرو — میں ورشا — ورشا — یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ؟ (پھر دستک ہوتی ہے)

عذرا :- ورشا اور عذرا کیا کرے — اب اس سے ملو ۔

سنتوش :- مگر عذرا میں نے اسے نہیں بلایا — پہلا خط میں نے شرارت کے طور پر لکھا تھا ۔ لیکن مجھے پتہ نہیں تھا کہ سچ مچ کوئی مرد بھرے نکل آئے گا — اب پرماتما کے لئے کچھ کرو ۔

عذرا :- بھئی میں کچھ نہیں کر سکتی ۔

(دستک ۔ ٹھک ۔ ٹھک ۔ ٹھک)

آواز :- (کھڑکی میں سے آتی ہے) کیا میں سامنے آسکتا ہوں ؟

عذرا :- آجاؤ ۔

سنتوش :- یہ تم نے کیا غضب کیا ؟

(بھاگنے لگتی ہے ۔ لیکن عذرا اُسے پکڑ لیتی ہے)

عذرا :- خاموش رہو ۔

(چند لمحات مکمل خاموشی میں گذرتے ہیں ۔ پھر ایک دم صفیہ کھڑکی میں سے نظر آتی ہے مردانہ کپڑے پہنے)

صفیہ :- (شرارت کے ساتھ) آداب عرض کرتا ہوں ۔

سنتوش :- کون ؟ صفیہ !

عذرا :- صفیہ نہیں ـــــ ایک مرد

صفیہ :- بھئی سنتوش - اس میں میرا کوئی قصور نہیں - یہ مجھے مردوں کا لباس پہنا کر پتھر کے پاس کھڑا کرنے والی عذرا ہے -

سنتوش :- تو ـــ تو ـــ یہ خط ... ؟

عذرا :- میں نے لکھا تھا ـــ جس طرح پہلا خط تم نے لکھا تھا -

(سب قہقہے لگاتی ہیں)

(بہت سی لڑکیاں ایک دم اندر داخل ہوتی ہیں اور شور مچانا شروع کر دیتی ہیں - سنتوش ان میں گھر جاتی ہے)

(پردہ)

مس فریا

شادی کے ایک مہینے بعد سہیل پریشان ہو گیا۔ اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا۔

اس کا خیال تھا کہ بچہ کم از کم تین سال کے بعد پیدا ہوگا مگر اب ایک دم یہ معلوم کر کے اس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ جس بچے کا اس کو وہم و گمان بھی نہیں تھا اس کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔ اس کی بیوی کو بھی اتنی جلدی ماں بننے کا شوق نہیں تھا اور سچ پوچھیے تو وہ ابھی خود بچہ تھی۔ چودہ پندرہ برس کی عمر کیا ہوتی ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے عائشہ گڑیاں کھیلتی تھی اور صرف پانچ مہینے کی بات ہے کہ سہیل نے اسے گلی میں جنگلی بلی کی طرح ننگے پنجوں پر خوانچے والے سے لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا۔ منہ لال کئے وہ اس سے کہہ رہی تھی: "تم نے مجھے کل بھی کھیلیں اسی طرح کم کر دی تھیں۔ تم بے ایمان ہو ۔۔۔ میرے پیسے کیا مفت کے آتے ہیں جو میں

تول میں ہر بار کم چیز لے لوں" اور اس نے زبردستی جھپٹا مار کر مٹھی بھر نمکین چنے اس کے خوانچے سے اُٹھا لئے تھے۔

اب سہیل یہ منظر یاد کرتا اور سوچتا کہ عائشہ کی گود میں بچہ ہو گا جب وہ گھر جاتے ہوئے ٹرین کا سفر کرے گی تو اپنے اس ننھے کو اسی طرح دودھ پلائے گی جس طرح ریل کے ڈبوں میں دوسری عورتیں پلایا کرتی ہیں ۔۔۔ اس کی لڑکی یا لڑکا اسی طرح چیخ پکار کریگا۔ اسی طرح ہونٹ سکیڑ کر رو دے گا۔ تو وہ عائشہ سے کہے گا" بچہ رو رو کر ہلکان ہوا جا رہا ہے۔ اور تم کھڑکی میں سے باہر کا تماشہ دیکھ رہی ہو"۔۔۔ اس کا تصور کرتے ہی سہیل کا حلق سوکھ جاتا ہے۔

اس عمر میں بچہ؟۔۔۔ بھئی میرا تو ستیاناس ہو جائے گا۔۔۔ ساری شاعری تباہ ہو جائے گی۔ وہ ماں بن جائے گی۔ میں باپ بن جاؤں گا۔ شادی کا باقی رہے گا کیا؟۔۔۔ صرف ایک مہینہ جس میں ہم دونوں میاں بیوی بن کے رہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اولاد کا سلسلہ کیوں میاں بیوی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اولاد بری چیز ہے بچے پیدا ہوں پر اس وقت جب اُن کی خواہش کی جائے یہ نہیں کہ بن بلائے مہمانوں کی طرح آن ٹپکیں۔ میں خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا۔ کیسے کیسے حسین خیال میرے دماغ میں پیدا ہو رہے تھے۔ شروع شروع کے دن تو ایک عجیب قسم کی افراتفری میں گزرے تھے۔ اب ایک مہینے کے بعد سب چیزوں کی نوک پلک درست ہوئی تھی۔ اب شادی کا اصلی لطف آنے لگا تھا کہ بیٹھے بٹھائے یہ آفت آگئی۔۔۔ ابھی جانے کتنے اور رہوں"

سہیل پریشان ہوگیا۔ اگر دفعتہً آسمان سے کوئی جہاز بم برسانا شروع کر دیتا تو وہ اس قدر پریشان نہ ہوتا مگر اس حادثے نے اس کا دماغی توازن درہم برہم کر دیا تھا۔ وہ اتنی جلدی باپ نہیں بننا چاہتا تھا۔

"میں اگر باپ بن جاؤں تو کوئی ہرج نہیں مگر مصیبت یہ کہ عائشہ ماں بن جائے گی — اس کو اتنی جلدی ہرگز ہرگز ماں نہیں بننا چاہیے۔ وہ جوانی کہاں رہے گی۔ اس کی جس کو میں اب بھی شادی ہونے کے بعد بھی کنکھیوں سے دیکھتا ہوں اور ایک لرزش سی اپنے خیالات میں محسوس کرتا ہوں۔ اس کی تیزی و طراری کہاں رہے گی — وہ بھولا پن جواب مجھے عائشہ میں نظر آتا ہے ماں بن کر بالکل غائب ہو جائے گا۔ وہ کھلنڈرا پن جو اس کی رگوں میں پھڑکتا ہے۔ مردہ ہو جائے گا — وہ ماں بن جائے گی اور صابن کے جھاگ کی طرح اس کی تمام چلبلاہٹیں بیٹھ جائیں گی — گود میں ایک چھوٹے سے روتے بچے کو لئے کبھی وہ میز پر پیپر ویٹ اٹھا کر بجائے گی۔ کبھی کنڈی ہلائے گی۔ اور کبھی کن سری تانوں میں اوٹ پٹانگ لوریاں سنائے گی — واللہ میں تو پاگل ہو جاؤں گا۔"

سہیل کو دیوانگی کی حد تک اس حادثے نے پریشان کر رکھا تھا۔ تین چار دن تک اس کی پریشانی کا کسی کو علم نہ ہوا۔ مگر اس کے بعد جب اس کا چہرہ فکر و تردد کے باعث مرجھا سا گیا تو ایک دن اس کی ماں نے کہا "سہیل کیا بات ہے۔ آج کل تم بہت اداس اداس رہتے ہو۔"

سہیل نے جواب دیا "کوئی بات نہیں امی جان — موسم ہی کچھ ایسا ہے۔"

موسم بے حد اچھا تھا ہواؤں میں لطافت تھی۔ وکٹوریہ گارڈن میں جب وہ

سیر کے لئے گیا تو اُسے بے شمار پھول کھلے ہوئے نظر آئے تھے۔ ہر رنگ کے ہر یادل بھی عام تھے۔ درختوں کے پتے اب مٹیالے نہیں تھے۔ ہر شے دھلی ہوئی نظر آتی تھی۔ مگر سہیل نے اپنی اُداسی کا باعث موسم کی خرابی بتایا۔

ماں نے جب یہ بات سُنی تو کہا "سہیل تو مجھ سے چھپاتا ہے ــــ دیکھ سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے ــــ عائشہ نے تو کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔

سہیل کے جی میں آئی کہ اپنی ماں سے کہہ دے "ایسی ویسی بات؟ ــــ امی جان اُس نے ایسی بات کی ہے کہ میری زندگی تباہ ہو گئی ہے ــــ مجھ سے پوچھے بغیر اُس نے ماں بننے کا ارادہ کر لیا ہے" مگر اُس نے یہ بات نہ کہی اس لئے کہ یہ سُن کر اس کی ماں یقینی طور پر خوش تر ہو گی۔

نہیں امی جان۔ عائشہ نے کوئی ایسی بات نہیں کی وہ تو بہت ہی اچھی لڑکی ہے آپ سے تو اُسے بے پناہ محبت ہے ــــ دراصل میری اُداسی کا باعث ــــ لیکن امی جان میں تو بہت خوش ہوں۔

یہ سُن کر اس کی ماں نے دعائیہ لہجے میں کہا "اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے عائشہ واقعی بہت اچھی لڑکی ہے ــــ میں تو اسے بالکل اپنی بیٹی کی طرح سمجھتی ہوں ــــ اچھا سہیل یہ تو بتا اب میرے دل کی مراد کب پوری ہو گی"

سہیل نے مصنوعی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"

"تو سب سمجھتا ہے ــــ میں پوچھتی ہوں کب تیرا لڑکا میری گود میں

کھیلے گا۔ سہیل دل کی ایک آرزو تھی کہ تجھے دلہا بنتا دیکھوں۔ سو یہ آرزو خدا نے پوری کر دی۔ اب اس کی بات کی تمنا ہے کہ تجھے پھلتا پھولتا بھی دیکھوں۔"

سہیل نے اپنی ماں کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا "امی جان، آپ تو ہر وقت ایسی ہی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ دو برس تک میں بالکل اولاد نہیں چاہتا۔"

"دو برس تک تو ــــ بالکل اولاد نہیں چاہتا، کیسے؟ ــــ یعنی تو اگر نہیں چاہے گا تو بچہ نہیں ہوگا؟ ــــ واہ! ایسا بھلا کبھی ہو سکتا ہے ــــ اولاد دینا نہ دینا اس کے ہاتھ میں ہے اولاد ضرور دے گا۔ اللہ کے حکم سے کل ہی میری گود میں پوتا کھیل رہا ہوگا۔"

سہیل نے اس کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ وہ کہتا بھی کیا۔ اگر وہ اپنی ماں کو بتا دیتا کہ عائشہ حاملہ ہو چکی ہے تو ظاہر ہے کہ سارا راز فاش ہو جاتا اور وہ بچے کی پیدائش روکنے کے لئے کچھ بھی نہ کر سکتا۔ شروع شروع میں اس نے سوچا تھا کہ شاید کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس نے اپنے شادی شدہ دوستوں سے سنا تھا کہ عورتوں کے حساب و کتاب میں کبھی کبھی ایسا ہیر پھیر ہو جایا کرتا ہے ابھی تک یہ خیال اس کے دماغ میں جما ہوا تھا۔ اس کے موہوم ہونے پر بھی اس کو امید تھی کہ چند ہی دنوں میں مطلع صاف ہو جائے گا۔

پندرہ بیس دن گزر گئے مگر مطلع صاف نہ ہوا۔ اب اس کی پریشانی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ وہ جب بھولی بھالی عائشہ کی طرف دیکھتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ کسی مداری کے تھیلے کی طرف دیکھ رہا ہے "آج عائشہ

میرے سامنے کھڑی ہے۔ کتنی اچھی لگتی ہے لیکن مہینوں میں اس کا پیٹ پھول کر ٹھلیا بن جائے گا۔ ہاتھ پیر سوج جائیں گے ۔۔۔ ہوا میں عجیب عجیب خوشبوئیں اور بدبوئیں سونگھتی پھرے گی قے کرے گی اور خدا معلوم کیا سے کیا بن جائے گی!"

سہیل نے اپنی پریشانی ماں سے چھپائے رکھی، بہن کو بھی پتہ نہ چلنے دیا مگر بیوی کو معلوم ہو ہی گیا۔ ایک روز سونے سے پہلے عائشہ نے بڑے تشویشناک لہجے میں اس سے کہا "کچھ دنوں سے آپ مجھے بے حد مضطرب نظر آتے ہیں ۔۔۔ کیا وجہ ہے؟"

لطف یہ ہے کہ عائشہ کو کچھ معلوم نہیں تھا ایک دو بار اس نے سہیل سے کہا تھا کہ اب کی دفعہ کیا ہو گیا ہے تو سہیل نے بات گول مول کر دی تھی۔ اور کہا تھا کہ شادی کے بعد بہت ہی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ ممکن ہے کوئی ایسی ہی تبدیلی ہو گئی ہو۔" مگر اب اسے سچی بات بتانا ہی پڑی "عائشہ میں اس لئے پریشان ہوں کہ تم ۔۔۔۔۔ تم اب ماں بننے والی ہو"

عائشہ شرما گئی "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں"

"کیسی باتیں کرتا ہوں۔ اب جو حقیقت ہے میں نے تم سے کہدی ہے تمہارے لئے یہ خوشخبری ہو گی مگر خدا کی قسم اس نے مجھے کئی دنوں سے پاگل بنا رکھا ہے"

عائشہ نے جب سہیل کو سنجیدہ دیکھا تو کہا "تو ۔۔۔۔ تو ۔۔۔ کیا یہ سچ مچ ؟ ۔۔۔۔"

ہاں ہاں — سچ مچ — تم ماں بننے والی ہو — خدا کی قسم جب میں سوچتا ہوں کہ چند مہینوں ہی میں تم کچھ اور ہی بن جاؤ گی تو میرے دماغ میں ایک ہل چل سی مچ جاتی ہے — میں نہیں چاہتا کہ اتنی جلدی بچہ پیدا ہو اب خدا کے لئے تم کچھ کرو۔"

عائشہ یہ بات سن کر صرف محجوب سی ہو گئی تھی۔ حجاب کے علاوہ اُس نے ہونیوالے بچے کے متعلق کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ دراصل یہ فیصلہ ہی نہیں کر سکتی تھی کہ اُسے خوش ہونا چاہیئے یا گھبراہٹ کا اظہار کرنا چاہیئے اس کو معلوم تھا کہ جب شادی ہوئی ہے تو بچہ ضرور پیدا ہو گا مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ سہیل اتنا پریشان ہو جائے گا۔

سہیل نے اس کو خاموش دیکھ کر کہا۔ اب سوچتی کیا ہو۔ کچھ کرو تاکہ اس بچے کی مصیبت ٹلے۔"

عائشہ دل ہی دل میں ہونے والے بچے کے ننھے ننھے کپڑوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ سہیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

کیا کہا؟

"میں کہتا ہوں کچھ بندوبست کرو کہ بچہ پیدا نہ ہو۔"

"بتایئے میں کیا کروں؟"

"اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں تم سے کیوں کہتا۔ تم عورت ہو۔ عورتوں سے ملتی رہی ہو۔ شادی پر تمہاری بیاہی ہوئی سہیلیوں نے تمہیں کئی مشورے دیئے ہوں گے یاد کرو۔ کسی سے پوچھو۔ کوئی نہ کوئی

ترکیب تو ضرور ہو گی ۔"

عائشہ نے اپنے حافظ پر زور دیا ۔ مگر اُسے کوئی ایسی ترکیب یاد نہ آئی مجھے تو آج تک کسی نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا ، پر میں پوچھتی ہوں کہ اتنے دن آپ نے مجھ سے کیوں نہ کہا ۔ جب بھی میں نے آپ سے اس بارے میں بات چیت کی آپ نے ٹال دیا ۔"

میں نے تمہیں پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا ۔ یہ بھی سوچتا رہا کہ شاید میرا واہمہ ہو ، پر اب کے بات بالکل پکی ہو گئی ہے ۔ تمہیں بتانا ہی پڑا ۔ عائشہ اگر اس کا کوئی علاج نہ ہوا تو خدا کی قسم بہت ہی آفت آ جائے گی ۔ آدمی شادی کرتا ہے کہ چند برس ہنسی خوشی میں گزارے ۔ یہ نہیں کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑیں ۔ جھٹ سے ایک بچہ پیدا ہو جائے ۔۔۔۔ کسی ڈاکٹر سے مشورہ لینا ہوں ۔"

عائشہ نے جواب دماغی طور پر سہیل کی پریشانی میں شریک ہو چکی تھی ۔ کہا ہاں ، کسی ڈاکٹر سے ضرور مشورہ لینا چاہیئے ۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ بچہ اتنی جلدی نہ ہو ۔"

سہیل نے سوچنا شروع کیا ۔ پولینڈ کا ایک ڈاکٹر اس کا واقف تھا ۔ پچھلے دنوں جب شراب کی بندش ہوئی تھی تو وہ اس ڈاکٹر کے ذریعہ ہی سے وسکی حاصل کرتا تھا ۔ پر اب وہ دیولالی میں نظر بند تھا ۔ کیوں کہ حکومت کو اس کی حرکات و سکنات پر شبہ ہو گیا تھا ۔ یہ ڈاکٹر نظر بند نہ ہوتا تو یقیناً سہیل کا کام کر دیتا ۔ اس پولستانی ڈاکٹر کے علاوہ ایک

یہودی ڈاکٹر کو بھی وہ جانتا تھا جس سے اس نے اپنی چھاتی کے درد کا علاج کرایا تھا سہیل اس کے پاس چلا جاتا مگر اس کا چہرہ اتنا رعب دار تھا کہ وہ اس سے ایسی بات کے متعلق ارادے کے باوجود مشورہ نہ لے سکتا۔

یوں تو بمبئی میں ہزاروں ڈاکٹر موجود تھے مگر بغیر واقفیت اس معاملے کے متعلق بات چیت ناممکن تھی —— بہت دیر تک غور و فکر کرنے کے بعد معاً اس کو مس فریا کا خیال آیا جو ناگپاڑے میں پریکٹس کرتی تھی اور اس کا خیال آتے ہی مس فریا اس کے آنکھوں کے سامنے آگئی۔

موٹے اور بھاری جسم کی یہ کرسچین عورت عجیب و غریب کپڑے پہنتی تھی۔ ناگپاڑے میں کئی یہودی، کرسچین اور پارسی لڑکیاں رہتی ہیں سہیل نے ان کو ہمیشہ چست اور شوخ رنگ لباسوں میں دیکھا تھا۔ سکرٹ گھٹنوں سے ذرا نیچی، ننگی پنڈلیاں، اونچی ایڑی کی سینڈل۔ سر کے بال کٹے ہوئے۔ ان میں لہریں پیدا کرنے کے نئے نئے طریقے، ہونٹوں پر گاڑھی سرخی، گالوں پر اڑے اڑے رنگ کا غازہ بھویں مونڈ کر تیکھی بنائی ہوئی۔ ان لڑکیوں کا بناؤ سنگھار کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ نگاہیں۔ ان چیزوں کو پہلے دیکھتی تھیں جن سے عورت بنتی ہے۔ مگر مس فریا ٹخنوں تک لمبا ڈھیلا ڈھالا فراک پہنتی تھی۔ پنڈلیاں ہمیشہ موٹی جرابوں سے ڈھکی رہتی تھیں۔ شو پہنتی تھی۔ بہت ہی پرانے فیشن کا بال کٹے ہوئے تھے مگر ان میں لہریں پیدا کرنے کی طرف وہ کبھی توجہ ہی نہیں دیتی تھی۔ اس بے توجہی کے باعث اس کے بالوں میں ایک عجیب قسم کی بے جانی اور خشکی پیدا ہوگئی تھی۔ رنگ کالا تھا جو کبھی کبھی سانولا ہو جاتا بھی

اختیار کر لیتا تھا۔

عائشہ نے تھوڑی دیر تک بچے کی پیدائش کے متعلق غور کیا اور سہیل کے پہلو میں سو گئی۔ غور و فکر ہمیشہ اس کو سلا دیا کرتا تھا۔

عائشہ سو گئی مگر سہیل جاگتا رہا اور مس فریا کے متعلق سوچتا رہا۔

ٹھیک ایک برس پہلے انہی دنوں میں جب اس کے کمرے میں نہ یہ نیا پلنگ تھا جو عائشہ جہیز میں لائی تھی۔ اور نہ خود عائشہ تھی تو سہیل نے ایک بار مس فریا کو خاص زاویے سے دیکھا تھا۔ سہیل کی بہن کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ بچہ کب پیدا ہوگا مس فریا کو بلایا گیا تھا۔ سہیل تازہ تازہ بمبئی آیا تھا۔ ناگپاڑے کی شوخ تیتریاں دیکھ کر جو بالکل اس کے پاس سے پھڑ پھڑاتی ہوئی گزر جاتی تھیں۔ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ وہ ان سب کو پکڑ کر اپنی جیب میں رکھ لے مگر جب یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور وہ ناامیدی کی حد تک پہنچ گیا تو اسے مس فریا دکھائی دی۔

پہلی نظر میں سہیل کے جمالیاتی ذوق کو صدمہ سا پہنچا ـــــ کیسی بے ڈول عورت ہے ـــــ لباس کیسا بیہودہ ہے اور قد......

تھوڑے ہی دنوں میں بھینس بن جائے گی۔“

مس فریا نے اس روز کالے رنگ کی جالی دار ٹوپی پہن رکھی تھی جس میں تین چار شوخ رنگ کے پھندنے لگے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم

ہوتا کہ کپڑے میں آ دو ہے گر پڑے ہیں ۔ فراک جو گھٹنوں تک بڑے اداس انداز میں لٹک رہا تھا چھپی ہوئی جارجٹ کا تھا پھول خوشنما تھے ۔ کپڑا بھی اچھا تھا مگر بہت ہی بھونڈے طریقے پر سیا گیا تھا ۔

مس فریا جب دوسرے کمرے سے فارغ ہو کر آئی تو اس نے سہیل سے انگریزی میں کہا " غسل خانہ کدھر ہے ۔ مجھے ہاتھ دھونے ہیں ۔"

غسل خانے میں سہیل نے مس فریا کو بہت ہی قریب سے دیکھا تو اسے نسوانیت کے کئی ذرّے اس کے ساتھ چمٹے ہوئے نظر آئے سہیل نے اب اسے پسند کرنے کی نیت سے دیکھنا شروع کیا " بجری نہیں ۔۔۔ آنکھیں خوب صورت ہیں ۔ میک اپ نہیں کرتی تو کیا ہوا ۔ ٹھیک ہے ۔ ہاتھ کیسے اچھے ہیں ۔"

مس فریا کے بالائی ہونٹ پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں ۔ کام کرنے کے باعث پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں ۔ سہیل نے جب ان کی طرف دیکھا تو مس فریا اسے پسند آ گئی ۔ پسینے کی یہ پھوار سی جو اس کی مونچھوں کی روئیں پر کپکپا رہی تھی ۔ اسے بہت ہی بھلی معلوم ہوئی ۔ سہیل کے جی آیا کہ وہ کچھ کرنا شروع کر دے جس سے اس کا سارا جسم عرق آلود ہو جائے ۔

مس فریا جب ہاتھ پونچھ کر فارغ ہو گئی تو اس نے سہیل کی ماں سے کہا ۔ " آپ ان کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے ۔ میں دوا تیار کر کے دے دوں گی

اور استعمال کرنے کی ترکیب بھی سمجھا دوں گی"۔

ناگپاڑے تک جہاں وہ پریکٹس کرتی تھی۔ وکٹوریہ میں سہیل نے اُس سے کوئی خاص بات نہ کی۔ کونین کے متعلق اُس نے چند باتیں دریافت کیں کہ ملیریا میں کتنی مقدار اس کی کھانی چاہیئے۔ پھر اس نے دانتوں کی صفائی کے بارے میں اس سے کچھ معلومات حاصل کیں کہ اتنے میں وہ جگہ آگئی جہاں مس فریا۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا بورڈ لٹکا رہتا تھا۔

پہلی منزل کے ایک کمرے میں مس فریا کا مطب تھا۔ اس کمرے کے دو حصے کیئے گئے تھے۔ ایک حصے میں مس فریا کی میز تھی جہاں وہ عام طور پر بیٹھی تھی۔ دوسرے حصے میں اس کی ڈسپنسری تھی۔ ڈسپنسری کی دو الماریوں کے علاوہ وہاں ایک چھوٹا سا تخت بھی تھا۔ جس پر غالباً وہ مریض لِٹا کر دیکھا کرتی تھی۔

مس فریا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی ٹوپی اُتار دی اور ایک کیل پر لٹکا دی۔ سہیل اُس بنچ پر بیٹھ گیا جو میز کے پاس بچھی ہوئی تھی۔ ٹوپی اُتار کر مس فریا نے نیم انگریزی اور نیم ہندوستانی لہجہ میں آواز دی۔ "چھوکرا"۔۔۔ کمرے کے دوسرے حصے سے ایک مریل سا آدمی نکل آیا اور کہنے لگا "ہاں میم صاحب"۔

میم صاحب کچھ نہ بولیں اور دوا بنانے کے لئے اندر چلی گئیں۔ سہیل اس دوران میں سوچتا رہا کہ مس فریا سے کسی طرح دوستی پیدا کرنا چاہیئے وہ تھوڑا سا وقت جو اُسے ملا اسی سوچ بچار میں خرچ ہو گیا۔ اور مس فریا

دوا بنا کر لے آئی - کرسی پر بیٹھ کر اس نے شیشی پر گوند سے لیبل چپکایا اور پڑیوں پر نمبر لگانے کے بعد کہا "یہ دو دوائیں ہیں - پڑیا ابھی جا کر پانی کے ساتھ دے دیجئے اور اس میں سے ایک خوراک آدھے گھنٹے کے بعد پلا دیجئے گا پھر ہر تیسرے گھنٹے کے بعد اسی طرح "

سہیل نے پڑیاں اٹھا کر جیب میں رکھ لیں - شیشی ہاتھ میں لے لی - اور مس فریا کی طرف کچھ عجیب نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا -

وہ گھبرا گئی "آپ بھول تو نہیں گئے "

سہیل نے اسی انداز سے دیکھتے ہوئے کہا "میں بھولا نہیں مجھے سب کچھ یاد ہے "

مس فریا کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے " تو ..... تو ..... ٹھیک ہے ..... "

سہیل دراصل اپنے ارادہ کو مکمل کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھے جا رہا تھا -

مس فریا نے چند کاغذات اٹھا کر میز کے ایک طرف رکھ دیئے " اِس کے ...... اِس کے دام ؟ "

سہیل نے خاموشی سے بٹوہ نکالا " گنتے ہوئے " یہ کہہ کر اس نے پانچ کا نوٹ بڑھا دیا -

مس فریا نے نوٹ لیا - میز کی دراز کھول کر اس میں رکھا - جلدی جلدی ریزگاری نکالی اور حساب کر کے باقی پیسے سہیل کی طرف

بڑھا دیئے۔

سہیل نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور جلدی سے کہا۔ ”تمہارا ہاتھ کتنا خوبصورت ہے“

مس فریا تھوڑی دیر تک فیصلہ نہ کر سکی کہ اُسے کیا کرنا چاہئیے ”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں“

سہیل نے بڑے ہی خام انداز میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا جیسے وہ اسٹیج پر عشقیہ پارٹ ادا کر رہا ہے ”میں تم سے محبت کرتا ہوں“

سہیل کو جب مس فریا کے لہجے میں کھردرا پن محسوس ہوا تو وہ چونکا اُس نے لوگوں سے سن رکھا تھا کہ اینگلو انڈین اور کرسچین لڑکیاں فوراً ہی پھنس جایا کرتی ہیں۔ چونکہ اسی سنی سنائی بات کے زیر اثر اُس نے اتنی جرأت کی تھی مگر یہاں جب اسے معاملہ بالکل برعکس نظر آیا تو اس نے جلدی سے دوا کی شیشی اُٹھائی اور کہا ”میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ دراصل مجھے آپ سے ایسی فضول باتیں نہیں کرنا چاہئیے تھیں۔ ۔ ۔ میں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نہ جانے کیا بک گیا مجھے معاف کر دیجئیے گا“

مس فریا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا غصّہ کچھ کم ہو گیا ”تم نے جو کچھ کیا ہے اس پر مجھے بیحد غصّہ آیا تھا۔ مگر میں اب تمہاری طرف دیکھتی ہوں تو مجھے تم بہت ہی معصوم نظر آتے ہو۔۔۔۔ بیوقوفی کی حد تک معصوم، جاؤ پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرنا“

سہیل سہم سا گیا۔ مس فریا کو وہ اسکول کی اُستانی سمجھنے لگا۔ "آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے نا "

مس فریا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا نہ ہوئی جو سہیل چاہتا تھا کہ پیدا ہو "جاؤ میں نے کہہ دیا کہ پھر ایسی حرکت نہ کرنا —— دوا کسی اور جگہ سے نہ لینا۔ کل یہیں چلے آنا —— اور دیکھو تم نے میرے آنے جانے کے پیسے نہیں دیئے۔

سہیل نے پوچھا "کتنے ہو گئے ہیں "

"بارہ آنے "

سہیل نے بارہ آنے میز پر رکھ دیئے اور جب وہ بازار میں پہنچا تو اُسے خیال آیا کہ وکٹوریہ والے کو تو وہ بارہ آنے ادا کر چکا تھا۔ لیکن اس نے سوچا کہ چلو بلا ٹل گئی ہے۔ کیا ہوا اگر بارہ آنے زیادہ چلے گئے۔

سہیل کا یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ امرتسر میں وہ کئی لڑکیوں سے ایسی اور اس سے بھی سخت جھڑکیاں کھا چکا تھا۔ چند گھنٹوں تک اس واقعہ کا سہیل پر بہت ہی زیادہ اثر رہا۔ لیکن جب وہ دوسرے دن مس فریا کے ہاں دوا لینے کے لئے گیا اس نے دوسرے گاہکوں کی طرح اس سے بات چیت کی تو وہ شرمندگی جس کا تھوڑا سا احساس باقی رہ گیا تھا دُور ہو گئی۔

دس بارہ روز تک وہ متواتر دوا لینے کے لئے مس فریا کے ہاں جاتا رہا۔ اس دوران میں کوئی ایسی بات نہ ہوئی جس سے سہیل کے دماغ میں

اس خفت انگیز واقعہ کی یاد تازہ ہوتی اس کے بعد اس کی بہن تندرست ہو گئی اور مس فریا اس عرصہ کے لئے اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی اب ایک دم بارہ تیرہ مہینے کے بعد سہیل کو اس کا خیال آیا اور اس نے اس سے مشورہ لینے کا ارادہ کیا "وہ عورت کو روپے پیسے کا بہت لالچ ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ضرور اس معاملہ میں ہماری مدد کرنے کو تیار ہو جائے گی اور پھر اس واقعہ کو اس بات سے کیا تعلق ہے۔ اگر وہ میرا کام کر دے گی تو میں اسے منہ مانگے دام ادا کر دوں گا۔"

دوسرے روز شام کو وہ مس فریا کے پاس گیا۔ سہیل کو دیکھ کر اس نے بڑے کاروباری انداز میں کہا۔ "بہت مدت کے بعد تشریف لائے۔"

سہیل شادی کے بعد اب کافی تبدیل ہو چکا تھا۔ آرام سے بنچ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا اس دوران میں کوئی بیمار نہیں ہوا اس لئے آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔

مس فریا مسکرائی "اب کیسے آنا ہوا۔"

سہیل نے جواب دیا "میں اپنی بیوی کے متعلق کچھ پوچھنے آیا ہوں ——"

مس فریا نے اور زیادہ متوجہ ہو کر پوچھا "آپ کی شادی ہو گئی؟"

"جی ہاں —— ہو گئی۔"

"کب ہوئی۔"

"ایک مہینہ پہلے۔"

"صرف ایک مہینہ"

مس فریا نے کرسی پر اپنا پہلو بدلا "کیسی ہے آپ کی بیوی"
سہیل نے بالکل رسمی انداز میں جواب دیا "بہت اچھی ہے"

"میرا مطلب ہے کہ...... کہ...... خوبصورت ہے؟ —— ضرور خوبصورت ہوگی۔ پنجاب کی لڑکیاں عام طور پر خوبصورت ہوتی ہیں"

سہیل نے فریا کی طرف دیکھا چہرے پر اس نے پوڈر لگا رکھا تھا جس سے رنگ بہت ہی بدنما ہو گیا تھا۔ بال خشک اور بے جان تھے۔ فراک بھی نہایت بھونڈا تھا جب اس نے عائشہ کا خیال کیا تو فریا اسے بھنگن معلوم ہوئی۔ دل ہی دل میں وہ ہنسا اور پرانا بدلہ لینے کی خاطر اس نے کہا "میری بیوی بہت خوبصورت ہے —— تم اسے دیکھو گی تو پتہ چلے گا۔

مس فریا نے شاید یہ بات نہ سنی۔ کیونکہ وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔
"تو ایک مہینے سے تم عیش کر رہے ہو"

سہیل نے پھر اسے جلانے کے لئے کہا "انسان کو زندگی میں ایک بار ایسا موقع ملتا ہے۔ کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے"

"ہاں، ہاں ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے...... مگر...... مگر زیادہ نہیں...... تم ضرور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوگے
مس فریا کے لہجے میں ایک عجیب قسم کی للچاہٹ تھی۔

سہیل کو اس گفتگو میں مزہ آنے لگا۔ مسکرا کر اس نے کہا۔ زیادہ سے زیادہ کیوں نہ اٹھایا جائے —— یہی وقت تو ہے کہ جی بھر کے لطف

اٹھایا جائے۔ بیوی اچھی ہو۔ طبیعتیں آپس میں مل جائیں ـــــ جوانی ہو۔ حالات سازگار ہوں۔ موسم خوشگوار ہو تو ......"

مس فریا مضطرب ہو گئی۔ یہ اضطراب چھپانے کی خاطر اس نے کہا "آپ ..... کس قسم کا مشورہ لینے کے لئے آئے ہیں۔

"میں اپنی بیوی کے متعلق کچھ پوچھنے آیا تھا"

"مس فریا پھر اسی رو میں بہہ گئی "میں ...... میں اس کو ضرور دیکھوں گی۔ مجھے ..... مجھے خوشی ہو گی کیسے معلوم تھا کہ تم اتنی جلدی شادی کر لو گے تمہاری زندگی میں ..... میرا مطلب ہے کہ تمہاری زندگی میں ضرور ایک بہت بڑی تبدیلی ہو گئی ہو گی۔

سہیل نے جواب دیا "تبدیلی ـــــ کوئی خاص تبدیلی پیدا تو نہیں ہوئی میں پہلے بھی ایسا ہی تھا ـــــ خاص فرق پڑ بھی کیا سکتا ہے۔

ہر حال میں خوش ہوں۔ بہت ہی خوش ہوں ـــــ شادی بہت اچھی چیز ہے؟

مس فریا نے تھوک نگل کر کہا "کیا شادی واقعی بہت اچھی چیز ہے؟"

بہت ہی اچھی چیز ہے ـــــ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی شادی کر لو"

مس فریا نے میز پر سے رنگین تیلیوں کا بنا ہوا جاپانی پنکھا اٹھایا اور جھلنا شروع کر دیا "مجھے اپنی بیوی کے متعلق کچھ اور بتاؤ ـــــ یعنی تمہاری ازدواجی زندگی کیسے گزر رہی ہے ..... اس کے خیالات کیا ہیں"

فریا کے ہونٹوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس کے ہونٹ کچھ اس انداز سے باتیں کرتے وقت کھل رہے تھے کہ سہیل کو محسوس ہوا فریا کے چہرے پر منہ کے بجائے ایک زخم ہے جس کے ٹانکے اُدھڑ رہے ہیں ــــ

سہیل نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور یوں دیکھتے ہوئے وہ ایک برس پیچھے چلا گیا۔ جب اُس نے بڑی نیک نیتی سے اس عورت میں چند خوبصورتیاں تلاش کی تھیں۔ اور ان کا سہارا لے کر اس سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی ایک نہایت ہی بھونڈی کوشش کی تھی۔ اب وہی عورت اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھی پنکھا جھل کر اپنا اندرونی اضطراب ہلکا کر رہی تھی۔ ایک برس اس کے کالے چہرے اور خشک بالوں پر سے مزید سیاہی اور خشکی پیدا کئے بغیر گزر گیا تھا۔ مگر سہیل اب بالکل تبدیل ہو چکا تھا وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مس فریا نے اس سے کہا "تم کتنے تبدیل ہو گئے ہو اب تم پورے مرد بن چکے ہو۔"

سہیل نے فریا کی طرف دیکھا۔ اُس کی مونچھوں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو رہے تھے ۔ ان کو دیکھ کر اب اس کے دل میں وہ پہلی سی خواہش پیدا نہ ہوئی۔

مس فریا نے پنکھا میز پر رکھ دیا اور کہنیاں ٹیک کر سہیل کی طرف اُن بلبلوں کی طرح دیکھنے لگی۔ جو موسم بہار میں لوٹ کر اُداس اُداس آوازیں نکالا کرتی ہیں۔

سہیل نے پنکھے کی ایک اکھڑی ہوئی تیلی نوچنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو مس فریا نے اسے آہستہ سے پکڑ کر کہا "یاد ہے تمہیں ایک دفعہ اسی طرح تم نے میرا ہاتھ دبایا تھا"

مس فریا کی آواز لرزاں تھی۔

سہیل نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بڑے خشک لہجہ میں کہا "مس فریا — تمہاری یہ حرکت بہت ہی نازیبا ہے ...... دیکھو، پھر کبھی ایسا نہ کرنا"

یہ کہہ کر مس نے اپنا بٹوا لرزتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا اور بارہ آنے نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ "یہ رہا تمہارے آنے جانے کا کرایہ"

سہیل جب نیچے اترا تو بازار میں چلتے ہوئے اس نے سوچا "جب بچہ پیدا ہوگا تو میں اسے گود میں اٹھا کر۔ مس فریا کے پاس ضرور آؤں گا۔ اور فخر کے ساتھ کہوں گا۔ اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

سہیل بہت خوش تھا۔ جب اس نے مزا لینے کی خاطر یہ سارا واقعہ دھرایا تو آخر میں بارہ آنے آئے جو مس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نکال کر مس فریا کی میز پر رکھے تھے "ارے — پر میں نے اسے بارہ آنے کیوں دیئے — یہ کرایہ کس بات کا تھا؟"

سہیل جب اس کا جواب تلاش نہ کر سکا تو بے اختیار ہنس پڑا۔

تین انگلیاں

افراد

باٹلی والا .... شوہر　　شیریں .... بیوی

جگن ناتھ ...... جوہری　　کرنل امرناتھ ...... جہان

پولیس انسپکٹر اور تین سپاہی

ایکٹ پہلا

پہلا منظر

ایک پُر تکلف طریقے پر سجا ہوا ڈرائنگ روم۔ کھڑکیوں پر ریشمی پردے لٹک رہے ہیں۔ قالین بچھا ہوا ہے جو کہ بہت دبیز ہے۔

باٹلی والا ایک صوفے پر اضطراب کے ساتھ اپنی ٹانگ ہلا رہا ہے عقب میں گھر کا نوکر تپائی پر رکھے ہوئے پھولدان کو جھاڑن سے صاف کرنے میں مشغول، گھنٹی بجتی ہے باٹلی والا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

باٹلی والا:۔ وہ آگئے (سنتو سے) دیکھو سنتو باہر کون ہے —— میرا خیال ہے کہ لالہ جگن ناتھ ہوں گے۔ جاؤ اگر وہی ہوں تو انہیں اندر لے لاؤ کہنا صاحب آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔

سنتو:۔ بہت اچھا سرکار۔

(سنتو چلا جاتا ہے)

باٹلی والا:۔ میرا خیال ہے جگن ناتھ ہی ہوگا —— یہ جوہری وقت اور زبان کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔

(سنتو اور جگن ناتھ دونوں کمرے میں داخل ہوتے ہیں)

سنتو:۔ صاحب، لالہ جی تشریف لے آئے ہیں۔

باٹلی والا:۔ آیئے آیئے۔ لالہ جی تشریف لے آیئے —— خوب وقت پر آئے۔

جگن ناتھ:۔ آپ نے یاد جو فرمایا تھا۔

باٹلی والا:۔ اِدھر کرسی پر تشریف رکھئے —— سنتو تم اب جا سکتے ہو —— آپ تشریف رکھئے۔

(سنتو چلا جاتا ہے)

جگن ناتھ:۔ فرمایئے! کیسے یاد کیا؟

باٹلی والا:۔ میں ابھی سب کچھ عرض کرتا ہوں۔ پہلے آپ فرمایئے کہ آپ کیا پئیں گے۔ آج سردی خوب زوروں پر ہے۔

جگن ناتھ:۔ جی نہیں تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔

باٹلی والا:۔ لالہ جی میں نے آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ مجھے موتیوں کے ایک ہار کی قیمت دریافت کرنا ہے۔

جگن ناتھ:۔ ہار لایئے۔

باٹلی والا:۔ ہار تو میرے پاس نہیں۔

جگن ناتھ:۔ تو میں قیمت کیسے بتاؤں؟

باٹلی والا:۔ (ہنس کر) میں ہار دکھائے بغیر آپ سے قیمت دریافت نہیں کروں گا میں ابھی ہار منگاتا ہوں۔ میری بیوی کے پاس ہے۔

جگن ناتھ:۔ آپ اسے بیچنا چاہتے ہیں؟

باٹلی والا:۔ ارادہ تو یہی ہے اگر قیمت اچھی مل جائے — اچھا تو میں ابھی ہار لے کر حاضر ہوتا ہوں۔

جگن ناتھ:۔ بہت بہتر ہے۔

باٹلی والا:۔ اگر کچھ دیر ہو جائے تو معاف فرما دیجئے گا۔

جگن ناتھ:۔ نہیں کوئی بات نہیں۔ مگر آپ جلدی واپس آنے کی کوشش کیجئے گا۔ کیونکہ مجھے دکان پر جانا ہے۔

باٹلی والا:۔ میں ابھی حاضر ہوا۔

(کمرے سے باہر چلا جاتا ہے)

دُوسرا منظر

ڈرائنگ روم کے ساتھ والا کمرۂ خواب۔ یہ بھی پُر تکلف ساز و سامان سے آراستہ ہے۔ ایک خوبصورت پلنگ پر تکیوں کا سہارا لیکر مسز باٹلی والا (شیریں) لیٹی ہے۔ خاوند کے قدموں کی آواز سنتی ہے۔ لیکن حرکت نہیں کرتی۔ وہ اندر داخل ہوتا ہے اور اس کے پاس آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ شیریں اس کی طرف بالکل بے توجہی سے دیکھتی ہے۔

باٹلی والا:۔ شیریں!

شیریں:۔ (روکھے پن سے) کیا ہے؟

باٹلی والا:۔ تم ابھی تک سو رہی ہو۔

شیریں:۔ تو کیا کروں؟

باٹلی والا:۔ اُٹھو کوئی بات چیت کرو۔

شیریں:۔ آج میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔

باٹلی والا:۔ کئی دنوں سے تم اس درد کی شکایت کر رہی ہو۔۔۔ کسی ڈاکٹر کو بلواؤں؟

شیریں:۔ نہیں —— تمہاری بہت مہربانی ہے۔
باٹلی والا:۔ تم مجھ سے ابھی تک ناراض ہو؟
شیریں:۔ کاش کہ میں ہو سکتی۔
باٹلی والا:۔ تم بات بات پر ٹھنڈی سانسیں بھرنا شروع کر دیتی ہو۔
شیریں:۔ قسمت میں ہے جو یہی۔
باٹلی والا:۔ قسمت کا گلہ ابھی تک تمہاری زبان پر ہے۔
شیریں:۔ زندہ جو ہوں۔
باٹلی والا:۔ تمہارے یہ زہر میں بجھے ہوئے تیر ابھی تک ختم نہیں ہوئے۔
شیریں:۔ میری رگ رگ میں تم خود زہر بھر چکے ہو۔
باٹلی والا:۔ تمہیں میری قسموں کا اعتبار نہیں آیا؟
شیریں:۔ آجاتا اگر تمہاری آنکھوں میں ہر وقت مجھے ایک سیّال خطرہ تیرتا نظر نہ آئے۔
باٹلی والا:۔ خطرہ —— کس بات کا خطرہ؟
شیریں:۔ جانے دو ان باتوں کو —— کہو کیسے آئے؟
باٹلی والا:۔ ایک دوست ابھی ابھی ملنے کے لئے آئے ہیں۔ باتوں باتوں تمہارے ہار کا تذکرہ ہوا۔ میں نے بہت تعریف کی۔ چنانچہ وہ دیکھنا چاہتے ہیں —— یہاں کے بہت بڑے جوہری ہیں۔
شیریں:۔ میرے صندوقچے میں پڑا ہے۔ لے جاؤ —— پر.....
باٹلی والا:۔ پر کیا؟

شیریں :- کچھ نہیں -

باٹلی والا :- کچھ تو ہے -

شیریں :- کہہ جو دیا - کچھ نہیں -

باٹلی والا :- تمہاری مرضی لیکن تمہارے من میں کوئی بات ضرور ہے -

(شیریں پلنگ پر سے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر بیٹھ جاتی ہے اور اپنی انگلیوں کے ناخن رگڑنا شروع کر دیتی ہے)

شیریں :- تمہارا خیال صحیح ہے ـــــ در اصل میں بہت تھکی ہوئی ہوں - جاؤ اپنے جوہری دوست کو ہار دکھاؤ - پھر بات کریں گے - (باٹلی والا اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل پر سے ایک صندوقچہ اٹھاتا ہے)

باٹلی والا :- اس صندوقچے میں ہے ؟

شیریں :- اسی میں ہے -

باٹلی والا :- تم اتنی قیمتی چیزوں کو یوں کھلے صندوقچے میں کیوں رکھا کرتی ہو؟ کچھ احتیاط تو ہونی چاہئے -

شیریں :- مجھے زیوروں سے اب کوئی دلچسپی نہیں -

باٹلی والا :- تعجب ہے -

شیریں :- واقعی تعجب ہے -

باٹلی والا :- تعجب ہے کہ اتنے سستے داموں پر یہ ہار مجھے کیسے مل گیا تھا ؟ ایسے خوبصورت اور گول موتی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھے ـــــ یہ بھی تعجب ہے کہ اس بارے میں تمہیں کوئی دلچسپی نہیں رہی ـــــ شیریں

تمہیں ٹھیک رقم یاد ہو گی۔ کتنے میں یہ ہار ہم نے خریدا تھا ؟

شیریں :۔ تم نے شادی سے پہلے لیا تھا ــــ جب تم مجھ سے محبت کیا کرتے تھے ۔

باٹلی والا :۔ مجھے یاد آگیا میں نے اسے سنگاپور میں چالیس ہزار روپے کا لیا تھا ــــ بہت سستا سودا تھا ۔ اس غریب کو روپے کی اشد ضرورت تھی ــــ بہت سستا سودا تھا ۔ کیوں شیریں ؟

شیریں :۔ سودا بیشک سستا تھا مگر سستے سودے سستے ہی ہوتے ہیں ۔ اگر مجھے حاصل کرنے کے لئے تمہیں کوئی بڑی قربانی کرنی پڑتی تو آج حالات بالکل مختلف ہوتے ــــ اصل میں عورت ہمیشہ بہت سستے داموں پر اپنا آپ حوالے کر دیتی ہے ۔

باٹلی والا :۔ اس موقع کو پانچ برس ہو گئے ــــ پانچ برس ــــ کتنے انقلاب آچکے ہیں ۔ مگر یہ ہار ویسے کا ویسا چمکیلا ہے ــــ تمہارے دانت بھی کبھی اسی طرح چمکا کرتے تھے ۔

شیریں :۔ کبھی ــــ ؟

باٹلی والا :۔ (وقفہ) عورتوں اور موتیوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔

شیریں :۔ اس لئے کہ موتیوں کا ہار رکھ دیا جا سکتا ہے ۔ عورتوں کا نہیں ۔

باٹلی والا :۔ (ہنستا ہے) ...... خوب کہا ــــ اچھا میں ابھی آتا ہوں ــــ یہ ہار اسے دکھا دوں ۔

شیریں :۔ جاؤ ۔

باٹلی والا ہار لے کر باہر چلا جاتا ہے۔ شیریں جماہی لے کر اٹھتی ہے اور پھر پلنگ پر لیٹ جاتی ہے۔

تیسرا منظر

وہی ڈرائنگ روم جو ہم پہلے منظر میں دکھا چکے ہیں۔ لالہ جگن ناتھ جوہری اٹھ کر ایک تصویر دیکھنے میں مشغول ہو جاتا ہے گویا اس طرح وقت کاٹنا چاہتا ہے کہ اتنے میں قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے اور باٹلی والا ہار لے کر اندر داخل ہوتا ہے)

باٹلی والا:۔ معاف فرمایئے گا لالہ جگن ناتھ صاحب ــــ مجھے بہت دیر ہو گئی۔

جگن ناتھ:۔ جی ہاں کافی دیر ہو گئی ــــ مگر خیر ــــ آپ ہار تو لے آئے؟

باٹلی والا:۔ جی ہاں۔ لے آیا۔ دیکھئے۔

(جگن ناتھ کی ہتھیلی پر ہار رکھ دیتا ہے ــــ جگن ناتھ اسے غور سے دیکھتا ہے)

باٹلی والا:۔ مجھے دیر اس لئے ہو گئی کہ میری بیوی نے اسے خدا معلوم کہاں رکھ چھوڑا تھا۔ بڑی تلاش کے بعد ملا ــــ اسے زیوروں سے بالکل دلچسپی نہیں۔

جگن ناتھ:۔ اس ہار سے بھی نہیں! ــــ مسٹر باٹلی والا۔ یہ تو بہت ہی قیمتی چیز ہے۔

باٹلی والا:۔ جی مجھے معلوم ہے۔

جگن ناتھ:۔ بہت ہی عمدہ موتی ہیں۔

باٹلی والا:۔ اچھے ہی تھے تو میں نے یہ ہار ایک بہت بڑی قیمت پر خریدا۔

جگن ناتھ:۔ کیا شک ہے —— آپ نے کم از کم —— کم از کم —— ساٹھ ہزار سے آپ نے کیا کم دیئے ہوں گے؟

باٹلی والا:۔ کم تو نہیں اس سے زیادہ دیئے تھے۔

جگن ناتھ:۔ تو آپ اسے بیچنا چاہتے ہیں؟

باٹلی والا:۔ مجھے روپیئے کی جیسا کہ آپ جانتے ہیں کوئی ضرورت نہیں لیکن اگر اچھی قیمت مل جائے تو میں اسے بیچ دوں گا —— میری بیوی سے کسی روز ایسے ہی کھو جائے گا —— دراصل وہ اس ہار کو منحوس بھی سمجھتی ہے۔

جگن ناتھ:۔ کوئی خاص بات ہے؟

باٹلی والا:۔ کوئی بھی نہیں —— عورتوں کے دماغ میں وہم پیدا ہوتے دیر ہی کیا لگتی ہے۔

جگن ناتھ:۔ درست فرمایا آپ نے —— تو آپ اسے بیچ ڈالنا چاہتے ہیں۔

(دونو صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں)

باٹلی والا:۔ اگر کوئی اچھا گاہک مل جائے۔

جگن ناتھ:- یہیں بھولا کرنل امرناتھ...

باٹلی والا:- جی نہیں، میں کرنل امرناتھ کو نہیں جانتا۔

جگن ناتھ:- ابھی حال ہی میں ریٹائر ہو کر آئے ہیں۔ پہلے سورت میں پریکٹس کیا کرتے تھے۔

باٹلی والا:- سورت میں —— میں سورت کا رہنے والا نہیں۔ وہاں کی میری بیوی ہے —— ہاں تو یہ کرنل امرناتھ.......

جگن ناتھ:- میرے بہت پرانے گاہک ہیں۔ شاید وہ یہ ہار لینا پسند کرلیں۔

باٹلی والا:- آدمی کیسا ہے؟

جگن ناتھ:- بےحد شریف آدمی ہیں —— ابھی نوجوان ہیں۔ نہ معلوم کیسے ریٹائر ہو کر یہاں چلے آئے؟

باٹلی والا:- تو یہ کرنل صاحب ہار لے لیں گے؟

جگن ناتھ:- میرا خیال ہے۔

باٹلی والا:- تو آپ ان سے بات چیت کیجئے —— مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔

جگن ناتھ:- بہت بہتر۔

باٹلی والا:- جب آپ نے کہا ہے کہ آدمی شریف ہے تو ایسا کیوں نہ کریں کہ اُسے یہیں بلوالیں۔ آج ہی رات دعوت کر دیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے۔ اگر ایسا ہو سکے —— اگر وہ یہاں آنا چاہے —— تھوڑی دیر باتیں بھی رہیں گی۔ کیا خیال ہے آپ کا؟

جگن ناتھ:۔ عجیب بات ہے وہ کل ہی آپ کا ذکر کر رہے تھے۔

باٹلی والا:۔ کس سلسلے میں؟

جگن ناتھ:۔ مجھے یاد نہیں رہا۔ لیکن ایسے ہی باتوں باتوں میں آپ کا ذکر آگیا تھا میرا تو یہ خیال تھا کہ آپ انہیں جانتے ہوں گے۔ کیونکہ جس طرح انہوں نے آپ کا ذکر کیا تھا۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اور آپ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

باٹلی والا:۔ خیر پہلے نہیں جانتے تھے تو اب جان لیں گے۔ آپ انہیں میری طرف سے دعوت دے دیجئے گا۔ کہئے گا کہ مسٹر اور مسز باٹلی والا آپ سے مل کر خوش ہوں گے —— اگر موقع ملا تو کار کی بات وہیں طے پر ہو جائے گی۔ آپ کی کمیشن تو ہر وقت کھری ہے۔

جگن ناتھ:۔ تو میں اب جاتا ہوں —— یہ لیجئے ہار۔

دونوں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ باٹلی والا ہار لے لیتا ہے۔

باٹلی والا:۔ آپ بھی تشریف لایئے گا —— یعنی اگر کرنل امر ناتھ ہماری دعوت قبول کر لیں تو آپ بھی ساتھ تشریف لایئے گا۔

جگن ناتھ:۔ بہت بہتر میں حاضر ہو جاؤں گا۔

باٹلی والا:۔ جی نہیں آپ کا آنا بہت ضروری ہے —— آپ کو آنا ہی پڑے گا۔

جگن ناتھ:۔ اگر انہوں نے دعوت قبول کر لی تو میں آپ کو فون کر دوں گا۔

باٹلی والا:۔ جی ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔

جگن ناتھ :- اچھا تو آداب عرض ہے ۔

باٹلی والا :- آداب عرض ہے ۔

(جگن ناتھ جوہری چلا جاتا ہے ۔ دوسرے دروازے سے
خود باٹلی والا ہار کو ہاتھوں میں اُچھالتا ہوا باہر نکل جاتا ہے)

چوتھا منظر

(شیریں کا کمرۂ خواب ۔ اب شیریں نیا لباس پہن کر آئینے کے سامنے
کھڑی ہے اور بڑی بددلی سے اپنے بال سنوار رہی ہے ،
اس کا شوہر ہاتھوں میں اسی طرح ہار اُچھالتا اندر آتا ہے اور
شیریں کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے ۔ شیریں اس کا عکس آئینے
میں دیکھتی ہے)

شیریں :- ہار دیکھ لیا تمہارے دوست نے !

باٹلی والا :- ہاں دیکھ لیا اور میری اُمید کے مطابق بہت پسند کیا اگر ہم اسے
بیچنا چاہیں تو ساٹھ ستر ہزار بڑی آسانی کے ساتھ مل سکتے ہیں ۔

شیریں :- بیچ دو ۔

باٹلی والا :- بیچ کے کیا کروں گا ــــ تم بیچ ڈالو ۔

شیریں :- بڑا آرہا ہے ۔

باٹلی والا:۔ اچھا تو سنبھالو —

شیریں:۔ رکھ دو اس میز پر۔

باٹلی والا:۔ (سنگھار میز پر ہار رکھ دیتا ہے اور آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)
تم آج کل اتنی اُداس کیوں رہتی ہو؟

شیریں:۔ (مڑکر) اب پھر وہی باتیں نہ شروع کرو — میں اداس ضرور
ہوں پر یہ باتیں اور بھی زیادہ اُداس ہیں۔

باٹلی والا:۔ تمہاری تفریح کے لئے آج میں نے دو دوستوں کو ڈنر پر بلایا
ہے۔

شیریں:۔ (سنگھار میز کے پاس سے ہٹ کر پلنگ کی طرف جاتے ہوئے)
یہ دو دوست کون ہیں؟

باٹلی والا:۔ ایک تو یہی ہوں گے جو ابھی آئے تھے۔ دوسرے ان کے دوست
ہیں۔ ان کو میں نہیں جانتا — تمہارا ہار دیکھیں گے۔ جگن ناتھ کہتا
تھا کہ وہ موتیوں کے عاشق ہیں — موتیوں کو کون پسند نہیں کرتا
ایک صرف تم ہو جو......

شیریں:۔ کیا میرا دعوت میں شامل ہونا ضروری ہے؟

باٹلی والا:۔ ضروری تو نہیں۔ تمہارا جی بہل جائے گا۔ ذرا اِدھر اُدھر کی
باتیں کریں گے۔ جگن ناتھ موتیوں کے قصے سنائے گا۔ اور اس
کا دوست جو کہ ڈاکٹر ہے۔ اور ابھی ابھی جنگ کے میدان سے
آیا ہے۔ مریضوں کی داستانیں سنائے گا۔

تم اس سے اپنے سر درد کی دوا بھی پوچھ لینا۔

شیریں :۔ تمہیں میری اتنی فکر نہیں کرنی چاہیئے۔

باٹلی والا :۔ (ہنستا ہے) بہت بہتر ـــــ میں یہاں سے چلا جاتا ہوں ؟

شیریں :۔ نہیں بیٹھو۔ لیکن ایسی باتیں شروع نہ کرو جس سے ..... خیر یہ ڈاکٹر کون ہیں ؟

(پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے)

باٹلی والا :۔ میں نہیں جانتا ـــــ اگر انہوں نے دعوت قبول کرلی تو آج شام کو پتہ لگ جائے گا ..... (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

باٹلی والا :۔ دیکھنا کون ہے ـــــ میرا خیال ہے جگن ناتھ ہوگا۔

شیریں :۔ یہی جو ابھی آئے تھے۔

باٹلی والا :۔ ہاں یہی ـــــ دیکھو تو۔

شیریں :۔ (اٹھ کر تپائی پر سے ٹیلیفون کا چونگا اٹھاتی ہے) .... ہلّو ـــــ مسز باٹلی والا اسپیکنگ ـــــ گڈ ایوننگ ـــــ جی ہاں ـــــ میرے پاس ہی بیٹھے ہیں ـــــ بہت بہتر ـــــ شکریہ ـــــ

(ٹیلیفون کا چونگا رکھ دیتی ہے)

باٹلی والا :۔ جگن ناتھ ہی تھا۔

شیریں :۔ وہی تھا ـــــ آپ کی دعوت قبول کرلی گئی ہے ـــــ نو بجے یہ لوگ پہنچ جائیں گے۔

ایکٹ دوسرا

رات کا وقت وہی ڈرائنگ روم جو ہم پہلے منظر میں دکھا چکے ہیں۔ پردہ اٹھتا ہے۔ گھڑیاں نو بجاتی ہے۔ باٹلی والا کرنل امر ناتھ اور جگن ناتھ تینوں کھڑے نظر آتے ہیں۔

باٹلی والا:۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی کرنل امر ناتھ۔

امر ناتھ:۔ آپ سے زیادہ مجھے ہوئی۔

باٹلی والا:۔ ہاتھ نہیں ملائیں گے آپ۔

امر ناتھ:۔ (ہنس کر) اتنے تکلفات کی کیا ضرورت ہے ــــ اس کے علاوہ ہاتھ ملانا کچھ مناسب نہیں سمجھتا۔ آپ برا نہ مانئیے گا۔ طبی نقطہ نگاہ سے ہاتھ ملانا ٹھیک نہیں۔

باٹلی والا:۔ (ہنستا ہے) نہ جانے کیا کیا نقطے اور پیدا کئے جائیں گے ــــ بہر حال آپ کی ہر بات ماننی پڑے گی۔

امر ناتھ:۔ (ہنستا ہے) ڈاکٹروں کی ہر بات مان لی جائے تو آدھی بیماریاں کم ہو جائیں۔

باٹلی والا:۔ جگن ناتھ صاحب آپ خاموش کیوں ہیں ــــ بتائیے کیا آپ کرنل صاحب کی ہر بات مان لیا کرتے ہیں؟

جگن ناتھ:۔ میں نے آج تک ان کی کوئی بات نہیں مانی۔

باٹلی والا :- یہی وجہ ہے کہ آپ کو ہمیشہ زکام کی شکایت رہتی ہے ۔

(امرناتھ ۔جگن ناتھ اور باٹلی والا تینوں ہیں اور صوفوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

باٹلی والا :- (توقف کے بعد) کرنل امرناتھ میں بہت ممنون ہوں کہ آپ غریب خانے پر بغیر کسی تعارف کے تشریف لے آئے ۔

امرناتھ :- آپ مجھے شرمندہ نہ کریں ۔ممنون مجھے ہونا چاہیئے ۔

باٹلی والا :- کرنل امرناتھ ۔میں آپ سے ایک بات پوچھوں ۔آپ اپنا ہاتھ جیب میں کیوں رکھتے ہیں ۔کیا اس میں بھی کوئی خاص نکتہ ہے ۔

امرناتھ :- (ہنس کر) جی نہیں ـــــ عادت سی ہوگئی ہے ۔

باٹلی والا :- آدمی عجیب عادت اختیار کر لیتا ہے (شیریں اندر داخل ہوتی ہے سیاہ لباس ہیں) لیجئے شیریں بھی آگئی ـــــ شیریں آؤ ـــــ کرنل امرناتھ سے ملو ۔

شیریں :- (چونک کر) کرنل امرناتھ . . . . . .

(امرناتھ اٹھ کر شیریں کی طرف دیکھتا ہے اور گھبرا سا جاتا ہے)

امرناتھ :- میں ـــــ میں !

باٹلی والا :- کرنل امرناتھ یہ میری بیوی ہے ۔

امرناتھ :- ب ـــــ ب ۔ بہت خوشی حاصل ہوئی ۔

باٹلی والا :- شیریں یہ کرنل امرناتھ ہیں ۔

شیریں :- آپ تشریف رکھئے ـــــ میں یہاں بیٹھ جاؤں گی ۔

(کرنل امرناتھ اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے شیریں ایک کرسی آگے کر کے اس پر بیٹھ جاتی ہے)

جگن ناتھ :- معلوم ہوتا ہے مسز باٹلی والا سے آپ کی پہلے ملاقات ہو چکی ہے۔

شیریں :- جی ہاں یہ سورت میں پریکٹس کیا کرتے تھے۔

باٹلی والا :- تو --- تو --- آپ نے مجھے کبھی دیکھا ہوگا؟ ممکن ہے کبھی ملاقات بھی ہوئی ہو۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ کبھی شیریں نے آپ سے طبی مشورہ بھی لیا ہو۔

امرناتھ :- جی ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔

باٹلی والا :- (اچانک جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہے) میں ابھی حاضر ہوا --- ایک ضروری ٹیلیفون کرنا ہے۔

(باہر چلا جاتا ہے)

جگن ناتھ :- کرنل امرناتھ۔ آپ نے مسز باٹلی والا کا ہار دیکھا؟

امرناتھ :- جی ہاں دیکھا ہے۔ سب سے پہلے میری نظر اسی پر پڑی تھی۔

شیریں :- آپ دیکھیے گا۔

امرناتھ :- اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔

شیریں :- مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آپ شوق سے دیکھیے --- یہ۔ یہ لیجیے --- (گلے سے ہار اتار کر امرناتھ کو دیتی ہے)

امرناتھ :- شکریہ --- بہت اچھا ہار ہے --- ہر ایک موتی اپنی جگہ۔

ہائیں یہ کیا ہوا؟ (ایک دم لائٹ اوف ہو جاتی ہے۔ بالکل اندھیرا چھا جاتا ہے)

جگن ناتھ:۔ لائٹ اوف ہو گئی۔

شیریں:۔ (گھبرا کر) ..... یہ کیا ہوا؟

امرناتھ:۔ کچھ نہیں..... ابھی روشنی ہو جائے گی۔

شیریں:۔ امرناتھ۔

جگن ناتھ:۔ مسز باٹلی والا ـــــ مسٹر باٹلی والا کہاں گئے؟

ایک دم شیریں کے چیخنے کی آواز ـــــ دو آدمیوں کی باہمی کشمکش ـــــ شیریں اور زیادہ زور سے چیختی ہے مگر یہ چیخ اس کے حلق ہی میں دبا دی جاتی ہے ـــــ گلا گھونٹا جاتا ہے۔ شیریں سانس لینے کی کوشش کرتی ہے مگر اُسے سانس نہیں آتا ـــــ اس دوران میں جگن ناتھ پاگلوں کی طرح چیختا رہتا ہے یہ مسٹر باٹلی والا ـــــ مسٹر باٹلی والا ـــــ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کوئی ہے ـــــ کوئی ہے ـــــ شیریں کچھ کہنا چاہتی ہے مگر اس کی آواز اس کے گلے ہی میں دبا دی جاتی ہے پھر ایک دم روشنی ہوتی ہے۔ قالین پر شیریں کی لاش پڑی دکھائی دیتی ہے۔

جگن ناتھ:۔ روشنی ہو گئی ـــــ م ـــــ م ـــــ مگر یہ کیا ہے ـــــ مسز باٹلی والا ـــــ مسز باٹلی والا بیہوش پڑی ہیں۔ کرنل امرناتھ ـــــ کرنل امرناتھ۔

(ایک لمحہ کے لئے مکمل سکوت)

جگن ناتھ:۔(زور سے) کرنل امر ناتھ۔

(قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔پھر سامنے کے دروازے سے باٹلی والا اندر داخل ہوتا ہے)

جگن ناتھ:۔کون؟

باٹلی والا:۔میں ہوں —— کیوں —— ارے یہ کیا ہوا (دوڑ کر شیریں کی لاش کے پاس جاتا ہے) —شیریں —— شیریں —— جگن ناتھ صاحب یہ کیا معاملہ ہے؟

جگن ناتھ:۔(لرزاں آواز میں) مجھے —— مجھے کچھ معلوم نہیں۔

باٹلی:۔شیریں —— شیریں —— (آواز بھرا جاتی ہے) شیریں —— اس کا گلا کس نے گھونٹا ہے؟ —— جگن ناتھ صاحب آپ دیکھ رہے ہیں یہ نشان گردن پر —— دس انگلیوں کے نشان صاف طور پر نظر آرہے ہیں —— کرنل امر ناتھ کہاں ہیں؟ (قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے۔باٹلی والا اٹھ کھڑا ہوتا ہے —— سامنے کے دروازے سے کرنل امر ناتھ اندر آتا ہے)

امر ناتھ:۔فرمایئے۔

جگن ناتھ:۔آپ کہاں چلے گئے تھے —— آپ نے —— آپ نے دیکھا۔یہ کیا ہو گیا ہے؟

امر ناتھ:۔(سنجیدگی کے ساتھ) میں ٹیلیفون کرنے گیا تھا۔

باٹلی والا:۔ ٹیلیفون ؟

امر ناتھ:۔ جی ہاں۔ پولیس اسٹیشن ٹیلیفون کرنا تھا۔

(سنتو پاگلوں کی طرح دوڑتا اندر آتا ہے)

سنتو:۔ سرکار — سرکار —

باٹلی والا:۔ کیا ہے ؟

سنتو:۔ تھانے سے کچھ آدمی آئے ہیں۔

باٹلی والا:۔ انہیں اندر بھیج دو۔

(سنتو باہر چلا جاتا ہے)

باٹلی والا:۔ ہار؟ — ہار کہاں ہے ؟ — شیریں نے ہار پہنا ہوا تھا۔

جگن ناتھ:۔ کرنل صاحب آپ نے لیا تھا۔

امر ناتھ:۔ میں نے — ہار لیا تھا۔ پر جب بجلی گل ہوئی تھی تو یہیں گر پڑا تھا — ٹھہریئے میں ڈھونڈتا ہوں۔

باٹلی والا:۔ کرنل امر ناتھ۔ آپ کی پوزیشن بہت نازک ہو گئی ہے۔ شیریں کو قتل کیا گیا ہے اور ہار غائب ہے۔

امر ناتھ:۔ آپ کا مطلب۔

باٹلی والا:۔ میرا مطلب بہت واضح ہے — پولیس اسٹیشن کو ٹیلیفون بھی آپ ہی نے کیا ہے — (انسپکٹر پولیس اور چند سپاہی اندر داخل ہوتے ہیں)

پولیس انسپکٹر:۔ یہاں سے ٹیلیفون کس نے کیا تھا ؟

امر ناتھ :۔ میں نے۔
انسپکٹر :۔ کیا ہوا ہے ؟
باٹلی والا :۔ دیکھ لیجئے ـــــ میری بیوی کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے اور ہار غائب ہے۔
انسپکٹر :۔ یہاں سے کوئی آدمی باہر تو نہیں گیا ؟
باٹلی والا :۔ جی نہیں ـــــ کرنل امر ناتھ میری بیوی کا ہار دیکھنے آئے تھے۔ لالہ جگن ناتھ جوہری کے ساتھ (جگن ناتھ کی طرف اشارہ کر کے)
انسپکٹر :۔ پھر کیا ہوا ؟
جگن ناتھ :۔ مسٹر باٹلی والا کہیں ٹیلیفون کرنے باہر گئے ـــــ تھوڑی دیر کے بعد یکا یک بجلی اوف ہو گئی اور کسی نے مسز باٹلی والا کا گلا گھونٹ دیا۔ اس قدر اندھیرا تھا کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا صرف آوازیں آتی تھیں۔
انسپکٹر :۔ کرنل امر ناتھ کہاں تھے ؟
امر ناتھ :۔ بجلی گل ہوتے ہی میں کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔
انسپکٹر :۔ کیوں ؟
امر ناتھ :۔ آپ کو ٹیلیفون کرنے کے لئے۔
انسپکٹر :۔ آپ نے مسز باٹلی والا کا ہار دیکھا ؟
امر ناتھ :۔ جی ہاں۔ انہوں نے اپنے گلے سے اتار کر دیا۔ مگر جب بجلی اوف ہوئی اور میں دوڑ کر باہر نکلا تو وہ یہیں گر گیا۔ تلاش کرنے پر مل جائے گا۔
باٹلی والا :۔ اگر وہ یہاں گرا ہوتا تو نظر آ جاتا۔

امرناتھ :- انسپکٹر صاحب ــــ میری طبیعت خراب ہے - نوازش ہوگی اگر آپ مجھے یہاں سے گھر جانے کی اجازت دے دیں۔

انسپکٹر :- کرنل امرناتھ آپ زیرِ حراست ہیں۔

امرناتھ :- زیرِ حراست ؟

انسپکٹر :- جی ہاں ــــ آپ دوسرے کمرے میں گئے تھے ــــ دیکھو جمال دین تم دوسرے کمرے میں جاکر ہار کو تلاش کرو۔

جمال دین :- بہت بہتر جناب۔

(باہر چلا جاتا ہے)

امرناتھ :- تو آپ کو مجھ پر شک ہے ؟

انسپکٹر :- مجھے ہر ایک پر شک ہے ؟

جگن ناتھ :- (گھبرا کر) مگر ــــ مگر میں تو بالکل نردوش ہوں۔

انسپکٹر :- تو آپ کی بیوی کا گلا گھونٹا گیا ہے (لاش کے پاس جاکر غور سے گردن کے نشانات دیکھتا ہے)...... ہاں گلا ہی گھونٹا گیا ہے اور بہت ظالمانہ طور پر گھونٹا گیا ہے - دس انگلیوں کے نشان گردن پر صاف نظر آرہے ہیں ــــ کرنل امرناتھ کو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔

باٹلی والا :- جی نہیں - آج ہی میرے گھر آئے ہیں - ہار دیکھنے کے لئے۔

انسپکٹر :- آپ کی بیوی کو جانتے تھے ؟

امرناتھ :- ایک دو بار سرسری ملاقات سورت میں ہوئی تھی۔

انسپکٹر:۔ ٹھیک!

(جمال دین سپاہی ہار اور ایک اوور کوٹ لیے انور خوش خوش داخل ہوتا ہے)

جمال دین:۔ انسپکٹر صاحب ہار مل گیا۔

امرناتھ:۔ یہ لیجئے صاحب ہار مل گیا۔

انسپکٹر:۔ کہاں سے ملا۔؟

جمال دین:۔ اس اوور کوٹ کی اندرونی جیب سے۔

انسپکٹر:۔ یہ کوٹ کس کا ہے؟

امرناتھ:۔ میرا ہے ـــ مگر یہ ہار میں نے اس میں نہیں رکھا۔

انسپکٹر:۔ کرنل صاحب اب معاملہ بالکل صاف ہے ـــ میں آپ کو مسز باٹلی والا کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔

امرناتھ: میں نے شیریں کو قتل نہیں کیا ـــ آپ ـــ آپ غلط کہتے ہیں۔

انسپکٹر:۔ میں غلط کہتا ہوں لیکن مرحومہ کی گردن غلط نہیں کہتی۔ اس پر آپ کے دونوں ہاتھ نہ مٹنے والا نقش چھوڑ گئے ہیں۔

امرناتھ:۔ تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے شیریں کا گلا گھونٹا ہے؟

انسپکٹر:۔ جی ہاں۔

امرناتھ:۔ اور یہ دس انگلیوں کے نشان جو بیچاری شیریں کی گردن پر نظر آ رہے ہیں میرے ہیں؟

انسپکٹر:۔ جی ہاں۔

امرناتھ:۔ تو آپ کو بہت بڑی بھول ہوئی ہے۔

انسپکٹر:۔ کیسے ؟

امرناتھ:۔ اِدھر دیکھئے ..... (کوٹ میں سے ہاتھ نکالتا ہے) ....

آپ میرا یہ ہاتھ دیکھ رہے ہیں —— یہ داہنا ہاتھ —— ایک۔ دو

تین —— اس میں تین انگلیاں نہیں ہیں —— ایک اپریشن میں

تین انگلیاں کٹوا کر مجھے جنگ کے میدان سے یہاں آنا پڑا ہے۔

سنّاٹا چھاجاتا ہے۔

انسپکٹر:۔ تین انگلیاں —— ہاں سچ مچ تین انگلیاں غائب ہیں تو پھر مسز

باٹلی والا کو قتل کس نے کیا ہے ؟

امرناتھ:۔ آپ مسٹر باٹلی والا کو اپنی بیوی شیریں کے قتل کے الزام میں

گرفتار کر لیجئے —— عدالت میں سارا واقعہ میں بیان کر دونگا ——

سورت میں بھی انہوں نے ایک دفعہ اس غریب کو زہر دیکر ہلاک کرنے

کی کوشش کی تھی۔ مگر میں نے بچا لیا تھا —— افسوس ہے کہ اس

مرتبہ باوجود کوشش کے اس کو نہ بچا سکا۔

(شیریں کی لاش کی طرف دیکھتا ہے اور رفرطِ غم سے منہ موڑ لیتا ہے)

باٹلی والا:۔ یہ جھوٹ ہے —— (کانپتی آواز میں) —— یہ جھوٹ ہے۔

انسپکٹر:۔ بھاگنے کی کوشش نہ کیجئے —— سپاہی مکان کے باہر بھی کھڑے

ہیں۔ انسپکٹر باٹلی والا کو پکڑ کر ہتھکڑی پہنا دیتا ہے۔

پردہ

آم

خزانے کے تمام کلرک جانتے تھے کہ منشی کریم بخش کی رسائی بڑے صاحب تک بھی ہے۔ چنانچہ وہ سب اس کی عزت کرتے تھے۔ ہر مہینے پنشن کے کاغذ بھرنے اور روپیہ لینے کے لئے جب وہ خزانے میں آتا تو اس کا کام اسی وجہ سے جلد جلد کر دیا جاتا تھا۔ پچاس روپے اس کو اپنی تیس سالہ خدمات کے عوض ہر مہینے سرکار کی طرف سے ملتے تھے۔ ہر مہینے دس دس کے پانچ نوٹ وہ اپنے خفیف طور پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پکڑتا اور اپنے پرانے وضع کے لمبے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیتا۔ چشمے میں سے خزانچی کی طرف تشکر بھری نظروں سے دیکھتا اور یہ کہہ کر "اگر زندگی ہوئی تو اگلے مہینے پھر سلام کرنے کے لئے حاضر ہونگا۔" بڑے صاحب کے کمرے کی طرف چلا جاتا۔

آٹھ برس سے اس کا یہی دستور تھا۔ خزانے کے قریب قریب ہر کلرک

کو معلوم تھا کہ منشی کریم بخش جو مطالبات خفیہ کی کچہری میں کبھی محافظِ دفتر ہوا کرتا تھا، بجید وضعدار، شریف الطبع اور حلیم آدمی ہے۔ منشی کریم بخش واقعی ان صفات کا مالک تھا۔ کچہری میں اپنی طویل ملازمت کے دوران میں افسرانِ بالا نے ہمیشہ اس کی تعریف کی ہے۔ بعض منصفوں کو منشی کریم بخش سے محبت ہو گئی تھی۔ اس کے خلوص کا ہر شخص قائل تھا۔

اس وقت منشی کریم بخش کی عمر پینسٹھ سے کچھ اوپر تھی۔ بڑھاپے میں آدمی عموماً کم گو اور حلیم ہو جاتا ہے۔ مگر وہ جوانی میں بھی ایسی ہی طبیعت کا مالک تھا۔ دوسروں کی خدمت کرنے کا شوق اس عمر میں بھی ویسے کا ویسا ہی قائم تھا۔

خزانے کا بڑا افسر منشی کریم بخش کے ایک مربّی اور مہربان جج کا لڑکا تھا۔ جج صاحب کی وفات پر اُسے بہت صدمہ ہوا تھا۔ اب وہ ہر مہینے ان کے لڑکے کو سلام کرنے کی غرض سے ضرور ملتا تھا۔ اِس سے اُسے بہت تسکین ہوتی تھی۔ منشی کریم بخش اُنہیں چھوٹے جج صاحب کہا کرتا تھا۔

پنشن کے پچاس روپے جیب میں ڈال کر وہ برآمدہ طے کرتا اور جوتی لگے کمرے کے پاس جا کر اپنی آمد کی اطلاع کراتا۔ چھوٹے جج صاحب اس کو زیادہ دیر تک باہر کھڑا نہ رکھتے۔ فوراً اندر بلا لیتے اور سب کام چھوڑ کر اس سے باتیں شروع کر دیتے۔

"تشریف رکھیے منشی صاحب — فرمائیے مزاج کیسا ہے"۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے —— آپ کی دعا سے بڑے مزے میں گزر رہی ہے۔ میرے لائق کوئی خدمت؟"

"آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمایئے خدمت گزاری تو بندے کا کام ہے۔"

"آپ کی بڑی نوازش ہے۔"

اس قسم کی رسمی گفتگو کے بعد منشی کریم بخش جج صاحب کی مہربانیوں کا ذکر چھیڑ دیتا۔ اُن کے بلند کردار کی وضاحت بڑے قدردانہ انداز میں کرتا اور بار بار کہتا۔ اللہ بخشے مرحوم فرشتہ خصلت انسان تھے۔ خدا ان کو کروڑ کروڑ جنت نصیب کرے۔"

منشی کریم بخش کے لہجے میں خوشامد وغیرہ کی ذرّہ بھر ملاوٹ نہیں ہوتی تھی، وہ جو کچھ کہتا تھا۔ محسوس کر کے کہتا تھا۔ اس کے متعلق جج صاحب کے لڑکے کو جو اب خزانے کے بڑے افسر تھے۔ اچھی طرح معلوم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کو عزت کے ساتھ اپنے پاس بٹھاتے تھے اور دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے تھے۔

ہر مہینے دوسری باتوں کے علاوہ منشی کریم بخش کے آم کے باغوں کا ذکر بھی آتا تھا۔ موسم آنے پر جج صاحب کے لڑکے کی کوٹھی پر آموں کا ایک ٹوکرا بھیج جاتا تھا۔ منشی کریم بخش کو خوش کرنے کے لئے وہ ہر مہینے اس کو یاددہانی کرا دیتے تھے۔ "منشی صاحب، دیکھئے اس موسم پر آموں کا ٹوکرا بھیجنا نہ بھولئے گا۔"

پچھلی بار آپ نے جو آم بھیجے تھے اس میں تو صرف دو میرے حصے میں آئے تھے "۔

کبھی یہ تین ہو جاتے تھے، کبھی چار اور کبھی صرف ایک ہی رہ جاتا تھا منشی کریم بخش یہ سن کر بہت خوش ہوتا تھا حضور ایسا کبھی ہو سکتا ہے ـــــ جونہی فصل تیار ہوئی میں فوراً ہی آپ کی خدمت میں ٹوکرہ لیکر حاضر ہو جاؤں گا ـــــ دو کھیٹے دو حاضر کر دوں گا۔ یہ باغ کس کے ہیں؟ ـــــ آپ ہی کے تو ہیں "۔

کبھی کبھی چھوٹے جج صاحب پوچھ لیا کرتے تھے "۔ منشی جی آپ کے باغ کہاں ہیں؟"

دینا نگر میں حضور ـــــ زیادہ نہیں ہیں صرف دو ہیں اس میں سے ایک تو میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو دے رکھا ہے۔ جو اُن دونوں کا انتظام وغیرہ کرتا ہے۔

مئی کی پنشن لینے کے لئے منشی کریم بخش جون کی دوسری تاریخ کو خزانے گیا۔ دس دس کے پانچ نوٹ اپنے خفیف طور پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ کر اس نے بڑے جج صاحب کے کمرے کا رُخ کیا۔ حسبِ معمول ان دونوں میں وہی رسمی باتیں ہوئیں۔ آخر میں آموں کا ذکر بھی آیا۔ جس پر منشی کریم بخش نے کہا " دینا نگر سے چٹھی آئی ہے کہ ابھی آموں کے منہ پر چیپ نہیں آیا۔ جونہی چیپ آگیا اور فصل پک کر تیار ہو گئی میں فوراً پہلا ٹوکرا لیکر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا ـــــ

چھوٹے جج صاحب! اس دفعہ ایسے تحفے آم ہوں گے۔ کہ آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ ملائی اور شہد کے گھونٹ نہ ہوئے تو میرا ذمہ۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ چھوٹے جج صاحب کے لئے ایک ٹوکرا خاص طور پر بھر دیا جائے۔ اور سواری گاڑی سے بھیجا جائے تاکہ جلدی اور احتیاط سے پہنچے۔ دس پندرہ روز آپ کو اور انتظار کرنا پڑے گا۔"

چھوٹے جج صاحب نے شکریہ ادا کیا۔ منشی کریم بخش نے اپنی چھتری اٹھائی اور خوش خوش گھر واپس آگیا۔

گھر میں اس کی بیوی اور بڑی لڑکی تھی۔ بیاہ کے دوسرے سال جس کا خاوند مر گیا تھا۔ منشی کریم بخش کی اور کوئی اولاد نہیں تھی مگر اس مختصر سے کنبے کے باوجود پچاس روپوؤں میں اس کا گذر بہت ہی مشکل سے ہوتا تھا اسی تنگی کے باعث اس کی بیوی کے تمام زیوران آٹھ برسوں میں آہستہ آہستہ بک گئے تھے۔

منشی کریم بخش فضول خرچ نہیں تھا اس کی بیوی اور وہ بڑے کفایت شعار تھے مگر اس کفایت شعاری کے باوصف تنخواہ میں سے ایک پیسہ بھی ان کے پاس نہ بچتا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ منشی کریم بخش چند آدمیوں کی خدمت کرنے میں بیحد مسرت محسوس کرتا تھا ان چند خاص الخاص آدمیوں کی خدمت گزاری میں جن سے اسے دلی عقیدت تھی۔

ان خاص آدمیوں میں سے ایک تو جج صاحب کے لڑکے تھے دوسرے ایک اور افسر تھے جو ریٹائر ہو کر اپنی زندگی کا بقایا حصہ ایک بہت بڑی

کوٹھی میں گزار رہے تھے۔ ان سے منشی کریم بخش کی ملاقات ہر روز صبح سویرے کمپنی باغ میں ہوتی تھی۔

باغ کی سیر کے دوران میں منشی کریم بخش ان سے ہر روز پچھلے دن کی خبریں سنتا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ بیتے ہوئے دنوں کے تار چھیڑ دیتا تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب اپنی بہادری کے قصّے سنانا شروع کر دیتے تھے کہ کس طرح انہوں نے لائل پور کے جنگلی علاقے میں ایک خونخوار قاتل کو پستول، خنجر دکھائے بغیر گرفتار کیا اور کس طرح ان کے رعب سے ایک ڈاکو سارا مال چھوڑ کر بھاگ گیا۔

کبھی کبھی منشی کریم بخش کے آم کے باغوں کا بھی ذکر آجاتا تھا "منشی صاحب کہئے۔ اب کی دفعہ فصل کیسی رہے گی؟" پھر چلتے چلتے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب یہ بھی کہتے۔

"پچھلے سال آپ نے جو آم بھجوائے تھے بہت ہی اچھے تھے۔ بیحد لذیذ تھے۔"

"انشاءاللہ خدا کے حکم سے اب کی دفعہ بھی ایسے ہی آم حاضر کردوں گا ایک ہی بوٹے کے ہوں گے۔ ویسے ہی لذیذ، بلکہ پہلے سے کچھ بڑھ چڑھ کر ہی ہوں گے۔"

اس آدمی کو بھی منشی کریم بخش ہر سال موسم پر ایک ٹوکرہ بھیجتا تھا۔ کوٹھی میں ٹوکرہ نوکروں کے حوالے کر کے جب وہ ڈپٹی صاحب سے ملتا اور وہ اس کا شکریہ ادا کرتے تو منشی کریم بخش نہایت ہی انکساری سے کام لیتے ہوئے کہتا "ڈپٹی صاحب آپ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں ——— اپنے باغ ہیں۔

اگر ایک ٹوکرہ یہاں لے آیا تو کیا ہو گیا۔ بازار سے ایک چھوڑ کر کئی ٹوکرے منگوا سکتے ہیں — یہ آم اپنے باغ کے ہیں اور باغ میں صرف ایک بوٹا ہے جس کے سب دانے گھلاوٹ خوشبو اور مٹھاس میں ایک جیسے ہیں اس لئے یہ چند تحفے کے طور پر لے آیا۔"

آم دینے کے بعد جب وہ کوٹھی سے باہر نکلتا تو اس کے چہرے پر تمتماہٹ ہوتی تھی ایک عجیب قسم کی روحانی تسکین اُسے محسوس ہوتی تھی جو کئی دنوں تک اس کو مسرور رکھتی تھی۔

منشی کریم بخش اکہرے جسم کا آدمی تھا۔ بڑھاپے نے اس کے بدن کو ڈھیلا کر دیا تھا مگر یہ ڈھیلا پن بدصورت معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہاتھوں کی پھولی ہوئی رگیں۔ سر کا خفیف سا ارتعاش اور چہرے کی گہری لکیریں اس کی متانت و سنجیدگی میں اضافہ کرتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑھاپے نے اس کو نکھار دیا ہے۔ کپڑے بھی وہ صاف ستھرے پہنتا تھا جس سے یہ نکھار ابھر آتا تھا۔

اس کے چہرے کا رنگ سفیدی مائل زرد تھا پیلے پیلے ہونٹ جو دانت نکل جانے کے باعث اندر کی طرف سمٹے رہتے تھے ہلکے سرخ تھے۔ خون کی اس کمی کے باعث اس کے چہرے پر ایسی صفائی پیدا ہو گئی تھی جو اچھی طرح منہ دھونے کے بعد تھوڑی دیر تک قائم رہا کرتی ہے۔

وہ کمزور ضرور تھا۔ پینسٹھ برس کی عمر میں کون کمزور نہیں ہو جاتا

مگر اس کمزوری کے باوجود اس میں کئی کئی میل پیدل چلنے کی ہمت تھی۔ خاص طور پر جب آموں کا موسم آتا تو وہ ڈپٹی صاحب اور چھوٹے جج صاحب کو آموں کے ٹوکرے بھیجنے کے لئے اتنی دوڑ دھوپ کرتا تھا کہ بیس پچیس برس کے جوان آدمی بھی کیا کریں گے۔ بڑے اہتمام سے ٹوکرے کھولے جاتے تھے۔ ان کا گھاس پھوس الگ کیا جاتا تھا۔ داغی یا گلے سڑے دانے الگ کئے جاتے تھے اور صاف ستھرے آم نئے ٹوکروں میں گن کر ڈالے جاتے تھے۔ منشی کریم بخش ایک بار پھر اپنا اطمینان کرنے کی خاطر ان کو گن لیتا تھا تاکہ بعد میں شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔

آم نکالتے اور ٹوکروں میں ڈالتے وقت منشی کریم بخش کی بہن اور اس کی بیوی کے منہ میں پانی بھر آتا۔ مگر وہ دونوں خاموش رہتیں۔ بڑے بڑے رس بھرے خوبصورت آموں کا ڈھیر دیکھ کر جب ان میں سے کوئی یہ کہے بغیر نہ رہ سکتی۔ کیا ہرج ہے اگر اس ٹوکرے میں سے دو آم نکال لئے جائیں" تو منشی کریم بخش سے یہ جواب ملتا "اور آجائیں گے اتنا بیتاب ہونے کی کیا ضرورت ہے"۔

یہ سن کر وہ دونوں چپ ہو جاتیں اور اپنا کام کرتی رہتیں۔

جب منشی کریم بخش کے گھر میں آموں کے ٹوکرے آتے تھے تو گلی کے سارے آدمیوں کو اس کی خبر لگ جاتی تھی۔ عبداللہ نیچہ بند کا لڑکا جو کبوتر بازی کا شوقین تھا۔ دوسرے روز ہی آدھمکتا تھا اور منشی کریم بخش کی بیوی سے کہتا تھا "خالہ میں گھاس لینے کے لئے آیا

بلوں۔ کل خالو جان آموں کے دو ٹوکرے لائے تھے۔ ان میں سے جتنی گھاس نکلی ہو مجھے دے دیجئے۔

ہمسائی نوراں جس نے کئی مرغیاں پال رکھی تھیں۔ اسی روز شام کو ملنے آ جاتی تھی اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا کرتی تھی۔ پچھلے برس جو تم نے مجھے ایک ٹوکرہ دیا تھا بالکل ٹوٹ گیا ہے۔ اب کے بھی ایک ٹوکرہ دیدو تو بڑی مہربانی ہوگی۔

دونوں ٹوکرے اور ان کی گھاس یوں چلی جاتی۔

حسب معمول اس دفعہ بھی آموں کے دو ٹوکرے آئے گلے سڑے دانے الگ کئے گئے جو اچھے تھے ان کو منشی کریم بخش نے اپنی نگرانی میں گنوا کر نئے ٹوکروں میں رکھوایا۔ بارہ بجے سے پہلے یہ کام ختم ہو گیا، چنانچہ دونوں ٹوکرے غسل خانے میں ٹھنڈی جگہ رکھ دیئے گئے۔ تاکہ آم خراب نہ ہو جائیں۔

اِدھر سے مطمئن ہو کر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد منشی کریم بخش کمرے میں چارپائی پر لیٹ گیا۔

جون کے آخری دن تھے۔ اس قدر گرمی تھی کہ دیواریں توے کی طرح تپ رہی تھیں۔ وہ گرمیوں میں عام طور پر غسل خانے کے اندر ٹھنڈے فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹا کرتا تھا۔ یہاں موری کے رستے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی آ جاتی تھی۔ لیکن اب کے اس میں دو بڑے بڑے ٹوکرے پڑے تھے۔ اس کو گرم کمرے ہی میں جو بالکل تنور بنا ہوا تھا۔ چھ بجے تک وقت

گزارنا تھا۔

ہر سال گرمیوں کے موسم میں جب آموں کے یہ ٹوکرے آتے اسے ایک دن آگ کے بستر پر گزارنا پڑتا تھا مگر وہ اس تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا تھا۔ قریباً پانچ گھنٹے تک چھوٹا سا پنکھا بار بار پانی میں تر کر کے جھلتا رہتا۔ انتہائی کوشش کرتا کہ نیند آجائے مگر ایک پل کے لئے بھی اُسے آرام نصیب نہ ہوتا۔ جون کی گرمی اور ضدی قسم کی مکھیاں کسے سونے دیتی ہیں۔

آموں کے ٹوکرے غسل خانے میں رکھوا کر جب وہ گرم کمرے میں لیٹا تو پنکھا جھلتے جھلتے ایک دم اس کا سر چکرا گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا سانس اُکھڑ رہا ہے۔ اور وہ سارے کا سارا گہرائیوں میں اُتر رہا ہے۔ اس قسم کے دورے اسے کئی بار پڑ چکے تھے۔ اس لئے کہ اس کا دل کمزور تھا مگر ایسا زبردست دورہ پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ سانس لینے میں اس کو بڑی دقت محسوس ہونے لگی۔ سر بہت زور سے چکرانے لگا۔ گھبرا کر اس نے آواز دی اور اپنی بیوی کو بلایا۔

یہ آواز سن کر اُس کی بیوی اور لڑکی دونوں دوڑی دوڑی اندر آئیں۔ دونوں جانتی تھیں کہ اسے اس قسم کے دورے کیوں پڑتے ہیں۔ فوراً ہی اس کی بہن نے عبداللہ نیچہ بند کے لڑکے کو بلایا اور اس سے کہا کہ ڈاکٹر کو بلا لائے تاکہ وہ طاقت کی سوئی لگا دے۔ لیکن چند منٹوں ہی میں تشنّی

کریم بخش کی حالت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ بے قراری اس قدر بڑھ گئی کہ وہ چارپائی پر مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کی بیوی اور بہن نے یہ دیکھ کر شور برپا کر دیا۔ جس کے باعث آس پاس کے کئی آدمی جمع ہو گئے۔

بہت کوشش کی گئی اس کی حالت ٹھیک ہو جائے۔ لیکن کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ ڈاکٹر بلانے کے لئے تین چار آدمی دوڑائے گئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی واپس آئے منشی کریم بخش زندگی کے آخری سانس لینے لگا۔ بڑی مشکل سے کروٹ بدل کر اس نے عبداللطیف پنبد کو جو اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ اپنی طرف متوجہ کیا اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا "تم سب لوگ باہر چلے جاؤ۔ میں اپنی بیوی سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"

سب لوگ باہر چلے گئے اس کی بیوی اور لڑکی دونوں اندر داخل ہوئیں رو رو کر ان کا برا حال ہو رہا تھا۔ منشی کریم بخش نے اشارے سے اپنی بیوی کو پاس بلایا اور کہا "دونوں ٹوکرے آج شام ہی ڈپٹی صاحب اور چھوٹے جج صاحب کی کوٹھی پر ضرور پہنچ جانے چاہئیں۔ پڑے پڑے خراب ہو جائیں گے"

ادھر ادھر دیکھ کر پھر اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔ دیکھو تمہیں میری قسم ہے۔ میری موت کے بعد بھی کسی کو آموں کا راز معلوم نہ ہو۔ کسی سے نہ کہنا کہ یہ آم ہم بازار سے خرید کر لوگوں کو بھیجتے تھے۔ کوئی پوچھے

تو یہی کہنا کہ دینا نگر میں ہمارے باغ ہیں۔ . . . . بس . . . . اور دیکھو جب میں مر جاؤں تو چھوٹے جج صاحب اور ڈپٹی صاحب کو ضرور اطلاع بھیج دینا۔"

چند لمحات کے بعد منشی کریم بخش مر گیا۔ اس کی موت سے ڈپٹی صاحب اور چھوٹے جج صاحب کو لوگوں نے مطلع کر دیا۔ مگر دونوں چند ناگزیر مجبوریوں کے باعث جنازے میں شامل نہ ہو سکے۔

دو ہزار سال بعد

خاوند:۔ میں نے کہا ۔۔۔ بنتی ہو۔
بیوی:۔ سن تو رہی ہوں ۔ بولو۔
خاوند:۔ ایک بہت بڑے عالم نے کہا ہے کہ ۔۔۔۔۔
بیوی:۔ مجھے یاد آیا یہ دھوبی تمہارے کالر کب استری کر کے لائے گا۔
خاوند:۔ لے آئے گا ــــ آج کل بڑے دنوں کے باعث کام بھی تو بہت ہو گا اس کے پاس ــــ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ایک بہت بڑے عالم نے ۔۔۔۔
بیوی:۔ اور وہ حلوہ سوہن کدھر گیا ــــ مجھے کل اپنی سہیلیوں کی ٹی پارٹی کرنا ہے ۔ بلقیس ناراض ہو جائے گی اگر تم حلوہ نہ لائے ۔
خاوند:۔ لے آؤں گا ۔ ٹی پارٹی آج تھوڑی ہے ۔ کل لے آؤں گا ۔ چاندنی چوک یہاں سے دور نہیں ــــ ہاں تو ــــ ایک بہت بڑے

عالم نے کہا ہے ۔۔۔

بیوی:۔ ٹھہرو، تم نے چاندنی چوک کہا تو مجھے ایک ضروری بات یاد آگئی ۔ میرا سوئیٹر بالکل پھٹ گیا ہے ۔ اُدھر جاؤ گے تو ایک نیا لیتے آنا ۔ نمبر تو تمہیں یاد ہی ہے ۔

خاوند:۔ مجھے اپنا پل اوور بھی لانا ہے ۔ کل نہیں تو پرسوں دونوں لیتا آؤں گا ۔ اور اگر تمہیں بہت جلدی ہے تو خود جا کر لے آؤ ۔ نوکر کو ساتھ لے جانا ۔ ـــــ ہاں تو میں کہہ رہا تھا ـــــ ہاں، ایک بہت بڑے عالم نے کہا ہے ۔۔۔۔۔

بیوی:۔ تم چھوڑو اور باتوں کو ـــــ بھئی تمہارے اس نوکر نے مجھے بہت تنگ کیا ہے ۔ پرلے درجے کا جھوٹا ہے ۔ بدزبان ہے اور مجھے خاطر ہی میں نہیں لاتا ۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں اور اب بھی کہتی ہوں کہ اس کا حساب صاف کرو ـــــ دو مہینے ہی کی تنخواہ تو ہے اس کو چھٹی دو اور نیا نوکر تلاش کرو ۔

خاوند:۔ کتنے نئے نوکر آچکے ہیں ۔ سب ایک جیسے ہی نکلے ـــــ میں تو سمجھتا ہوں کہ نوکروں میں کوئی فرق ہی نہیں ہوتا اور اب جو تم کہتی ہو تو خیر مانے لیتا ہوں کل اس کا حساب چکا دوں گا اور نئے نوکروں کے لئے اپنے چند دوستوں سے کہہ دوں گا ـــــ تو ـــــ تو ـــــ ہاں ـــــ تو میں اس عالم کی بات کہہ رہا تھا ۔ وہ کہتا ہے ۔

بیوی:- ٹھہرو ـــ یہ منّے کے رونے کی آواز تو نہیں۔

خاوند:- نہیں تو ـــ کیوں خیریت تو ہے؟

بیوی:- کل سے اس کے دشمنوں کی طبیعت خراب ہے تم تو سارا دن دفتر میں رہتے ہو۔ اور دفتر سے آتے ہو تو کلب گھر چلے جاتے ہو تمہیں اس کی خیریت سے کیا واسطہ۔

خاوند:- لو بھئی تم نے تو گلے شکوے شروع کر دیئے ـــ چھوڑو ان باتوں کو اور سنو تمہیں ایک مزیدار بات سناتا ہوں ـــ ایک بہت بڑے عالم نے کہا ہے......

بیوی:- پہلے میری بات کا جواب دو۔

خاوند:- بولو؟

بیوی:- نہیں پھر پوچھوں گی ـــ اچھا بھلا بتاؤ تو میری سالگرہ کب ہے۔

خاوند:- مجھے تاریخ اچھی طرح یاد ہے اور مجھے اپنا وعدہ بھی یاد ہے ـــ تمہیں سالگرہ کے روز صبح سویرے اپنی پسند کی ساڑھی مِل جائے گی۔ لو بس اب خوش ہوئیں ـــ ہاں تو ـــ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک بہت بڑے عالم نے کہا ہے......

بیوی:- ساڑھی وہی ہو جس پر مور بنے ہیں۔ بلاؤز کا کپڑا بھی وہیں لوں گی۔ جو میں نے پسند کیا ہوا ہے ـــ اچھا اب بتاؤ

اس نے کیا کہا ہے ؟

خاوند :- ایک بہت بڑے عالم نے کہا ہے کہ دو ہزار سال کے بعد دُنیا پر عورتوں کا راج ہوگا - پر میں اب سوچتا ہوں کہ دو ہزار سال بعد کیوں ؟ . . . .

خونی تھوک

گاڑی آنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔

مسافروں کے گروہ کے گروہ پلیٹ فارم کے سنگین سینے کو روندتے ہوئے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے پھل بیچنے والی گاڑیاں ربڑ ٹائر پہیوں پر خاموشی سے تیر رہی تھیں۔ بجلی کے سینکڑوں قمقمے اپنی نہ جھپکنے والی آنکھوں سے ایک دوسرے کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ برقی پنکھے سرد آہوں کی صورت میں اپنی ہوا پلیٹ فارم کی گدلی فضا میں بکھیر رہے تھے دور سے ریل کی پٹڑی کے پہلو میں ایک لیمپ سرخ نگاہوں سے مسافروں کی آمد و رفت کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا ــــ پلیٹ فارم کی فضا سگریٹ کے تند دھوئیں اور مسافروں کے شور میں لپٹی ہوئی تھی۔

پلیٹ فارم پر ہر ایک اپنی دھن میں مست تھا۔ تین چار بنچ پر بیٹھے

اپنی ہونے والی سیر کا تذکرہ کر رہے تھے۔ ایک گھڑی کے نیچے خدا معلوم کن خیالات میں غرق گنگنا رہا تھا۔ دور کونے میں نیا بیاہا جوڑا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ خاوند اپنی بیوی کو کچھ کھانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ اور وہ شرما کر مسکرا دیتی تھی۔ پلیٹ فارم کے دوسرے سرے پر ایک نوجوان قلیوں کے ساتھ ساتھ لڑکھڑا کر چل رہا تھا جو اس کی بہن کا تابوت اٹھائے ہوئے تھے۔ پانچ چھ فوجی سپاہی ہاتھ میں چھڑیاں لئے اور سیٹی بجاتے ہوئے ریفرشمنٹ روم سے شراب پی کر نکل رہے تھے۔ ایک سٹال پر چند مسافر اپنا وقت ٹالنے کی خاطر یونہی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے میں مشغول تھے۔ بہت سے قلی سرخ وردیاں پہنے گاڑی کی روشنی کا امید بھری نگاہوں سے انتظار کر رہے تھے ——— ریفرشمنٹ روم کے اندر ایک صاحب انگریزی لباس زیب تن کئے سگار کا دھواں اڑا کر وقت کاٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"قلیوں کی زندگی بھی گدھوں سے بدتر ہے!"

"مگر میاں کیا کریں۔ آخر پیٹ کہاں سے پالیں"

"ایک قلی دن بھر میں کتنا کما لیتا ہے"

"یہی آٹھ دس آنے! ———"

"یعنی صرف جینے کا سہارا ——— اور اگر بال بچے ہوں تو اپنا پیٹ کاٹ کر ان کا منہ بھریں۔ خالد خدا کی قسم جب ان لوگوں کی تاریک زندگی کا خیال ایک دفعہ بھی میرے دماغ میں آجائے تو پہروں یہی سوچتا ہوں کہ آیا انکی مصیبت

ہماری نام نہاد تہذیب پر بدنما داغ نہیں ہے ؟"

دو دوست پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

خالد اپنے دوست کی گفتگو سن کر قدرے متعجب ہوا اور مسکرا کر کہنے لگا

کیوں میاں یہ لیتین کب سے بنے ہو تم ؟ ـــــ تہذیب کس بلا کا نام ہے۔

ـــــ انسانیت کے سر دلو ہے پر جما ہوا زنگ ! ـــــ جانے دو ـــــ ایسی

باتوں کو، جانتے ہو میں پہلے ہی سے اپنے حواس کھوئے بیٹھا ہوں"۔

"خالد سچ کہہ رہے ہو ـــ یہ باتیں واقعی دماغ کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔

دو روز ہوئے اخبار میں ایک خبر پڑھی کہ پندرہ مزدور کارخانے میں آگ لگ

جانے سے جلے ہوئے کاغذ کی مانند راکھ ہو گئے۔ کارخانہ بیمہ شدہ تھا مالک

کو روپیہ مل گیا مگر پندرہ عورتیں بیوہ بن گئیں اور خدا معلوم کتنے بچے یتیم ہو گئے

کل تین نمبر پلیٹ فارم پر ایک خاکروب کام کام کرتے کرتے گاڑی تلے آ کر

مر گیا۔ کسی نے آنسو تک نہ بہایا ـــــ جب سے یہ واقعہ دیکھا ہے طبیعت

سخت مغموم ہے ـ یقینی جانو حلق سے روٹی کا ٹکڑا نیچے نہیں اُترتا

جب دیکھا اس خاکروب کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش آنکھیں نکالے

میری طرف گھور رہی ہے ـــــ مجھے اس کے گھر ضرور جانا چاہیئے۔

شاید میں اس کے بچوں کی کچھ مدد کر سکوں "۔

خالد مسکرایا اور اپنے دوست کا ہاتھ دبا کر کہنے لگا "جاؤ ـــــ

پندرہ مزدوروں کی بیکس بیویوں کی مدد بھی کرو ـ یہ ایک نیک اور مبارک

جذبہ ہے مگر اس کے ساتھ ہی شہر سے کچھ فاصلے پر چند ایسے لوگ بھی

آباد ہیں۔ جن کے پاس ایک وقت کے لئے سوکھی روٹی کا نصف ٹکڑا بھی میسر نہیں ـــــ گلیوں میں ایسے بچے بھی ہیں جن کے سروں پر کوئی دست شفقت رکھنے والا نہیں۔ ایسی سینکڑوں عورتیں موجود ہیں جن کا حسن غربت کے کیچڑ میں گل سڑ رہا ہے ـــــ بتاؤ! تم کس کس کی مدد کرو گے؟ ان ان پھیلے ہوئے ہاتھوں میں سے کس کی مٹھی بھرو گے؟ ـــــ ہزاروں ننگے جسموں میں سے کتنوں کی ستر پوشی کرو گے؟"

آہ! درست کہتے ہو خالد!! ـــــ درست کہتے ہو، مگر بتاؤ اس تاریک آندھی کو کس طرح روکا جا سکتا ہے؟ ـــ اپنے ہم جنس افراد کو ذلّت کی زندگی بسر کرتے دیکھنا۔ ننگے سینوں پر چمکتے ہوئے بوٹوں کی ٹھوکریں لگتے دیکھنا ـــ سخت بھیانک خواب ہے!"

"واقعات کی رفتار کا نتیجہ دیکھنے کا انتظار کرو۔ یہ لوگ اپنی طاقت کے باوجود اس طوفان کو نہیں روک سکتے۔ خود اعتمادی نے انہیں برداشت کرنا سکھا دیا ہے۔"

چنگاری کو شعلوں میں تبدیل کر دینا آسان ہے مگر چنگاری پیدا کرنا بہت مشکل ہے ـــ بہر حال تمہیں امید رکھنی چاہیئے۔ شاید تمہاری زندگی ہی میں مصائب کے بادل دور ہو جائیں۔"

میں یہ سہانا وقت دیکھنے کے لئے اپنی زندگی کے بقایا سال نذر کرنے کو تیار ہوں۔"

"کاش یہی خیال باقی لوگوں کے دل میں بھی موجود ہوتا! ـــــ مگر

یاد گاڑی آج کچھ دیر سے آتی معلوم ہوتی ہے۔ دیکھو نا پٹری پر روشنی کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔"

خالد کا دوست کسی گہری فکر میں غوطہ زن تھا اس لئے اس نے اپنے دوست کے آخری الفاظ بالکل نہ سُنے۔ اور اگر اس نے سنے تو کچھ خیال کرتے کہنے لگا۔" واقعی یہ خیال پیدا کرنا چاہیئے اور اگر —"

" چھوڑو میاں اب اس فلسفے کو — کچھ پتہ ہے گاڑی کب آنے والی ہے۔" خالد نے اپنے دوست کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

" گاڑی" اور پھر سامنے والی گھڑی کی طرف نگاہ اٹھا کر نو بجکر پچیس منٹ، بس دس منٹ تک آجائے گی — یعنی دس منٹ کے بعد ہمارا دوست ہمارے پاس ہوگا۔ ذرا خیال تو کرو۔ میں وحید کی آمد اس دردناک گفتگو کی وجہ سے بالکل بھول چکا تھا۔"

یہ کہتے ہوئے خالد کے دوست نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانا شروع کر دیا۔

پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ مسافر بڑی سرعت سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ اسباب کے ڈھیروں کے پاس خاموش کھڑے گاڑی کے منتظر تھے۔ کہ جلدی اپنے کام سے فارغ ہو کر ایک آنہ حاصل کر سکیں۔ خوانچہ والے دوسرے پلیٹ فارموں سے جمع ہو کر اپنی مخصوص صدا بلند کر رہے تھے۔ فضا گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ، مختلف انجنوں کی پھپ پھپ، خوانچہ والوں کی صداؤں، مسافروں کی باہم گفتگو

کے شور اور تلیوں کی بھدّی آوازوں سے معمور تھی ——— برقی پنکھے بدستور آہیں بھر رہے تھے۔

ریفرشمنٹ روم کے اندر بیٹھے ہوئے مسافر نے جو ابھی سگار کو دانتوں میں دبائے کش لے رہا تھا۔ اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف بڑی بے پرواہی کے انداز میں دیکھا اور بازو کو جھٹکا دے کر مریل میز پر سہارا دیتے ہوئے بلند آواز میں بولا "بوائے"

تھوڑی دیر خادم کا انتظار کرنے کے بعد وہ پھر چیخا۔ "بوائے، بوائے" اور پھر آہستہ آہستہ بڑبڑاتے ہوئے "نمک حرام"

"جی آیا حضور" دوسرے کمرے میں سے کسی کی آواز آئی۔

ساتھ ہی سپید لباس پہنے ایک خادم بھاگ کر اس مسافر کے قریب مؤدب کھڑا ہو گیا۔

"حضور"

"ہم نے تمہیں دو دفعہ آواز دی ——— سوئے رہتے ہو تم لوگ شاید!"

"حضور میں نے سنا نہیں۔ ورنہ کیا مجال ہے کہ غلام حاضر نہ ہوتا"

غلام کا لفظ سن کر مسافر کا غصہ فرد ہو گیا۔

"دیکھو درجۂ اوّل کے مسافروں سے یہ بے رخی اچھی نہیں۔ ہم تمہارے بڑے صاحب کے بھی کان کھینچ سکتا ہے سمجھے"

"جی ہاں"

ایجنٹ کے! ـــــ وہ ہمارا دوست ہے ـــــ خیر! دیکھو تم ویٹنگ روم میں جاؤ اور ہمارے قلی سے کہو کہ وہ صاحب کا تمام اسباب پلیٹ فارم پر لے جائے گاڑی آنے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں۔"

"بہت اچھا حضور!"

"اور ہاں ہمارا بل دوسرے آدمی کے ہاتھ بھجوا دو۔"

"دیکھو! ـــــ بل میں پانچسو پچپن نمبر سگریٹ کے ایک ڈبے کے دام بھی شامل کر لینا ـــــ پانچسو پچپن نمبر کا ڈبہ، خیال رہے۔"

"بل اور ڈبہ گاڑی میں لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔ وقت تھوڑا ہے۔"

"جو مرضی میں آئے کرنا، مگر اب تم جاؤ اور جلد ہمارے قلی کو اسباب نکالنے کے لئے کہہ دو۔"

مسافر نے یہ کہہ کر ایک انگڑائی لی اور میز پر پڑے ہوئے شراب کے گلاس میں سے آخری گھونٹ ایک ہی جرعے میں ختم کر دیئے، گیلے ہونٹ ایک بے داغ ریشمی رومال سے صاف کرنے کے بعد وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا۔

صاحب کو دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر ایک خادم نے جلدی دروازہ کھول دیا۔ مسافر بڑی رعونت سے ٹہلتا ٹہلتا پلیٹ فارم کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔

وہ ریل کی آہنی پٹریوں کے درمیان خیرہ کن روشنی کا ایک دھبّہ نظر آرہا تھا جو آہستہ آہستہ آس پاس کی تاریکی کو چیرتا ہوا بڑھ رہا تھا تھوڑی دیر کے بعد یہ دھبّہ روشنی کی ایک لمبی دھاری میں تبدیل ہوگیا اور دفعتہً انجن کی چوندھیا دینے والی روشنی ایک لمحے کے لئے پلیٹ فارم کے قمقموں کو اندھا بناتی ہوئی گل ہوگئی۔ ساتھ ہی کچھ عرصے کے لئے انجن کے آہنی پہیّوں کی بھاری گڑگڑاہٹ تلے پلیٹ فارم کا شور دب کر رہ گیا۔ ایک چیخ کے ساتھ گاڑی اسٹیشن کے چبوترے کے پہلو میں کھڑی ہوگئی۔

پلیٹ فارم کا دبا ہوا شور انجن کی گڑگڑاہٹ سے آزاد ہوکر ایک نئی تازگی سے بلند ہوا۔ مسافروں کی دوڑ دھوپ، بچوں کے رونے کی آواز، قلیوں کی بھاگ دوڑ، اسباب نکالنے کا شور، ٹھیلوں کی کھڑکھڑاہٹ خوانچہ والوں کی بلند صدائیں، شنٹ کرتے ہوئے انجنوں کی دلخراش چیخیں اور بھاپ نکلنے کی شاں شاں پلیٹ فارم کی آہنی چھت تلے فضا میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے تیر رہی تھی۔

"خالد ـــــ وحید کو دیکھا تم نے کسی ڈبے میں؟"

"نہیں تو۔"

"خدا جانے اس گاڑی سے آیا بھی ہے یا نہیں۔"

"تار میں تو اسی گاڑی کا ذکر تھا ـــ ارے وہ ڈبہ میں کون ہے؟"

"وحید!"

"ہاں، ہاں وحید"

دونوں دوست بھاگتے ہوئے اس ڈبے کی طرف بڑھے جس میں سے وحید اپنا اسباب اتروا رہا تھا۔

ریفرشمنٹ روم والا مسافر تیزی سے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھا باہر دروازے کے برابر لگے ہوئے کاغذ کو ایک نظر دیکھنے کے بعد دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور پیتل کی ایک سلاخ پکڑ کر قلی اور اپنے اسباب کا انتظار کرنے لگا۔

قلی اسباب سے لدا پھندا گاڑی کے ڈبوں کی طرف دیکھ دیکھ کر دوڑا چلا آ رہا تھا۔ مسافر نے اسے دیکھا اور جھلا کر بلند آواز میں کہا۔

"ابے اندھے ادھر آ"

قلی نے مسافر کی آواز پہچان کر ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ مگر بھیڑ میں خود مسافر کو نہ دیکھ سکا۔ وہ ابھی اسی پریشانی میں تھا کہ ایک اور آواز آئی — کیوں نظر نہیں آ رہا کیا؟ — اِدھر اِدھر — ناک کی سیدھ!"

قلی نے مسافر کو دیکھ لیا اور اسباب لے کر اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

صاحب ایک طرف ہٹ جائیے، میں اسباب اندر رکھ دوں۔"

"ہاں رکھو"۔ مسافر دروازے کے قریب ایک گدے دار نشست پر بیٹھ گیا۔ مگر اتنا عرصہ سو رہے تھے کیا؟ خانساماں نے تمہیں یہ نہیں کہا تھا کہ صاحب کا سامان اُٹھا کر گاڑی آتے ہی فوراً ڈبے میں رکھ

دیتا۔"
مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کس ڈبے میں سوار ہوں گے۔ قلی نے ایک بھاری ٹرنک بالائی نشست پر رکھتے ہوئے کہا۔
"یہ ہمارا ریزرو ہے۔ باہر چیٹ پر ہمارا نام بھی لکھا ہوا ہے۔"
آپ نے پہلے کہا ہوتا تو ہرگز دیر نہ ہوتی ——— ایک، دو، تین ——— آٹھ ——— اور یہ دس۔" قلی نے اسباب کی مختلف اشیاء گننا شروع کر دیں۔
سامان قرینے سے رکھنے کے بعد قلی نے اپنے اطمینان کے لئے ایک بار پھر رکھی ہوئی چیزوں پر نگاہ ڈالی اور ڈبے سے نیچے پلیٹ فارم پر اتر گیا۔
"صاحب اپنا سامان پورا کر لیجئے۔"
مسافر نے بڑی بے پرواہی سے اپنی جیب سے ایک نفیس بٹوہ نکالا اور ابھی کھول کر مزدوری ادا کرنے والا ہی تھا کہ اُسے کچھ یاد آگیا۔
"ہماری چھڑی کہاں ہے؟"
"چھڑی ——— چھڑی تو آپ ہی کے پاس تھی۔"
"میرے پاس بکتا ہے ——— وہیں چھوڑ آیا ہوگا تو۔"
چھڑی آپ کے پاس تھی ——— مگر صاحب اس سخت کلامی سے پیش آنا درست نہیں۔ جب میں نے کوئی خطا نہیں کی ———"
قلی کی زبان سے اس قسم کے الفاظ سن کر مسافر آگ بگولا ہو گیا اور

جگہ سے اُٹھ کر دروازے کے پاس کھڑا ہو کر چلانے لگا۔

"سخت کلامی سے پیش آنا درست نہیں ——— کسی نواب کا بچّہ ہے! جتنے کی چھڑی ہے اتنی تو تیری اپنی قیمت بھی نہیں۔ چھڑی لیکر آتا ہے۔

" یا نہیں؟ چور کہیں کا؟"

چور کے لفظ نے قلی کے دل میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ اس کے جی میں آئی کہ اس مسافر کی ٹانگ پکڑ کر نیچے کھینچ لے اور اسے اس اکڑفوں کا مزا چکھا دے۔ مگر طبیعت پر قابو پا کر خاموش ہو گیا اور نرمی سے کہنے لگا۔

"آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے ——— چھڑی آپ نے کہیں رکھ دی ہوگی، مجھے بتائیے میں وہاں سے لے آؤں"

"گویا میں بے وقوف ہوں ——— میں کہہ رہا ہوں چھڑی لے کر آ، ورنہ ساری شیخی کرکری کر دوں گا"

قلی ابھی کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ اُسے چند قدم کے فاصلے پر خانساماں نظر آیا جو ہاتھ میں سگریٹ کا ڈبہ اور چھڑی لئے چلا آرہا تھا۔

"چھڑی خانساماں لے کر آ رہا ہے اور آپ خواہ مخواہ مجھ پر برس رہے ہیں"

"بکو مت ——— کُتّے کی طرح چلّا رہا ہے"

یہ سُن کر قلی غصّے سے بھرا ہوا مسافر کی طرف بڑھا۔ مسافر نے

پورے زور سے اُس کے بڑھے ہوئے سینے میں اپنے نوکیلے بوٹ سے ٹھوکر ماری۔ ٹھوکر کھاتے ہی تلی چکراتا ہوا سنگین فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

تلی کو گرتے دیکھ کر بہت سے لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔

"بیچارے کو سخت چوٹ آئی ہے"

"یہ لوگ بہانہ بھی کرتے ہیں"

"منہ میں سے شاید خون نکل رہا ہے"

"معاملہ کیا ہے"

"اُس آدمی نے اِسے بوٹ سے ٹھوکر ماری ہے"

"کہیں مر نہ جائے بے چارہ"

"کوئی دوڑ کر پانی کا ایک گلاس تو لائے"

بھئی ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو، ہوا تو آنے دو"

تلی کے گرد جمع ہوتے ہوئے لوگ آپس میں طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد خالد اور اُس کا دوست بھیڑ چیر کر گرے ہوئے مزدور کے قریب پہنچے۔ خالد نے اُس کے سر کو اپنے گھٹنوں پر اٹھا لیا اور اخبار سے ہوا دینا شروع کر دی۔ پھر اپنے دوست سے مخاطب ہو کر بولا۔

"مسعود جلدی سے کہدو کہ اب ہم اس سے گھر پر مل سکیں گے اور وہاں اس ظالم کو دیکھنا کہاں ہے۔ گاڑی چلنے والی ہے کہیں چلا نہ جائے"۔

یہ سنتے ہی لوگ اس مسافر کے ڈبے کے پاس جمع ہو گئے جو کھڑکی کے پاس بیٹھا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اخبار پکڑے پڑھنے کی بے سود کوشش کر رہا تھا۔

مسعود اپنے دوست وحید سے رخصت ہو کر اس مسافر کی طرف بڑھا اور کھڑکی کے قریب جاکر نہایت شائستگی سے کہا آپ یہاں اخبار بینی میں مصروف ہیں اور وہ بے چارہ بے ہوش پڑا ہے "۔

" پھر میں کیا کروں ؟"

" چلئے اور کم از کم اس کی حالت تو ملاحظہ کیجئے "۔

" کمبخت نے میرے سفر کا تمام لطف بدمزہ کر دیا اور پھر دروازے سے باہر نکلتے ہوئے " چلئے صاحب ـــ یہ مصیبت بھی دیکھنا تھی "۔

خالد بے ہوش قلی کا سر تھامے اسے پانی پلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لوگ جھکے ہوئے خالد اور قلی کے چہرے کی طرف بغور دیکھ رہے تھے۔

" خالد آپ تشریف لے آئے ہیں " مسعود نے مسافر کو آگے بڑھنے کے لئے کہا "۔

" ہاں جناب ـــ یہ ہے آپ کے ظلم کا شکار ـــ کسی ڈاکٹر کو ہی بلوا لیا ہوتا آپ نے " مسعود نے مسافر سے کہا۔

مسافر قلی کے زرد چہرے اور لوگوں کا گروہ دیکھ کر بہت خوف زدہ ہوا اور گھبراتے ہوئے جیب سے اپنا بٹوہ نکالا۔

مسافر ابھی بٹوہ نکال ہی رہا تھا۔ قلی کا جسم متحرک ہوا اور اس نے اپنی آنکھیں کھول کر ہجوم کی طرف پریشان نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔

"یہ نوٹ آپ اسے میری طرف سے دے دیجئے گا۔ میں جلا رہا ہوں گاڑی کا وقت ہو گیا ہے" ۔ مسافر نے مسعود کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے انگریزی زبان میں کہا اور پھر قلی کو ہوش میں آتا دیکھ کر اس سے مخاطب ہوا۔ "ہم نے اس غلطی کی قیمت ادا کر دی ہے"۔

قلی یہ سن کر تڑپا۔ منہ سے خون کی ایک دھار بہہ نکلی۔ بڑی کوشش کے بعد اس نے یہ چند الفاظ اپنی زخمی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر ادا کئے:۔

میں بھی انگریزی زبان جانتا ہوں۔۔۔۔۔۔ دس روپے۔۔۔۔ ایک انسان کی جان کی قیمت۔۔۔۔۔۔ میرے پاس بھی کچھ ہے۔۔۔۔ جو۔۔۔۔۔

باقی الفاظ اس کے خون بھرے منہ میں بلبلے بن کر رہ گئے مسافر قلی کی یہ حالت دیکھ کر اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ دبا کر کہنے لگا۔ "میں زیادہ بھی دے سکتا ہوں"!

قلی نے بڑی تکلیف سے مسافر کی طرف رُخ پھیرا اور منہ سے خون کے بلبلے نکالتے ہوئے کہا:۔

"میرے پاس۔۔۔۔۔ بھی۔۔۔ کچھ ہے۔۔۔۔۔ یہ لو۔۔۔۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے مسافر کے منہ پر تھوک دیا۔ تڑپا اور پلیٹ فارم کی آہنی چھت کی طرف مظلوم نگاہوں سے دیکھتا ہوا خالد کی گود میں سرد ہو گیا۔

مسافر کا منہ خونی تھوک سے رنگا ہوا تھا۔

خالد اور مسعود نے لاش دوسرے آدمیوں کے حوالے کر کے مسافر کو پکڑ کر پولیس کے سپرد کر دیا۔

مسافر کا مقدمہ دو مہینے تک متواتر عدالت میں چلتا رہا۔

آخر فیصلہ سنایا گیا۔ فاضل جج نے ملزم کو تھوڑا سا جرمانہ کرنے کے بعد بری کر دیا۔ فیصلہ میں یہ لکھا تھا کہ قلی کی موت اچانک تلی پھٹ جانے سے واقع ہوئی ہے۔

فیصلہ سناتے وقت، خالد اور مسعود بھی موجود تھے۔ ملزم ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

"قانون کا قفل طلائی چابی سے کھل سکتا ہے"

"مگر ایسی چابی ٹوٹ بھی جایا کرتی ہے"

خالد اور اس کا دوست باہر برآمدے میں گفتگو کر رہے تھے۔

تین تحفے

راگ اور محبت دل پر ایک جیسا اثر کرتے ہیں۔ دونوں کے محر ایک جیسے نرم و نازک اور تیز و تند ہیں۔ دونوں میں تلخی و شیرینی پہلو بہ پہلو کروٹیں لیتی ہے دونوں روح کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ موسیقی محبت سے زیادہ کا فسوں ہے —— وادیٔ نیل میں پہلی بار قدم رکھنے والی رقاصہ بینیا راگ اور محبت کے ہر محر کی خفیف سے خفیف لرزش سے واقف تھی اور وہ محسوس کرتی تھی کہ مصر کے سب سے بڑے معبد کی مشہور مغنیہ پلینگو بھی اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔

ساتھ برس تک وہ وادیٔ نیل کی رنگین فضاؤں میں اپنی زندگی کا کوئی نیا سپنا دیکھے بغیر سانس لیتی رہی —— ساتھ برس تک وہ اپنی زندگی کا ایک ہی ورق پڑھتی رہی اور اسے نیا باب کھولنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی مگر جونہی اس کے شباب نے بیسویں منزل میں قدم رکھا امنگیں دوڑ کر اس کے

سینے میں داخل ہو گئیں اور اس کی کتاب زندگی کے تتّے اوراق مچلنے لگے۔
اس کا شباب جو کہ پہلے گونگا تھا بولنے لگا۔ اور اس کے کان دنیا کی دوسری آوازوں پر بند ہو کر اس کی جوانی کی باتیں سننے میں مشغول ہو گئے۔
ایک صبح جبکہ سورج کی کنواری کرنیں دریائے نیل میں نہا رہی تھیں۔ بنیلا جوانی کی بھاری نیند سے بیدار ہوئی۔ اس کے سنبھالے نہ سنبھلنے والے شباب نے اُسے تھکا دیا تھا۔ اس کی بڑی خادمہ پاس ہی قالین پر بیٹھی اس کی تھکاوٹ دُور کرنے کے لئے یہ گیت گا رہی تھی۔

گیت

سحر کی طرح خنک اور جاں فزا ہو تم
کہ یک مجسمۂ نکہت و ضیا ہو تم
گھنی بھویں ہیں تمہاری دراز پلکیں ہیں
کسی حسین مصوّر کی التجا ہو تم
تمہاری آنکھوں سے یوں جھانکتی ہے موسیقی
کہ جیسے جسم کے بربط میں اک نوا ہو تم
(اعظم)

(وہ یہ گاتی ہے کہ بنیلا مضطرب ہو کر اس سے کہتی ہے)

بنیلا:۔ جالا ــــــ جالا ــــــ طربین اتار دے ــــــ سازوں کے تار توڑ ڈال اپنے گلے میں سُر کو ہمیشہ کے لئے دبا دے اور آ میرے ساتھ رو۔ اس دن کا ماتم کر جب بنیلا پیدا ہوئی تھی۔

جالا:۔ آج پھر جذبات میں وہی طوفان آیا ــــــ میں جانتی تھی کل کی خاموشی

ضرور رنگ لائے گی۔

بنیلا:۔ میں تجھ سے کیا کہوں جالا۔۔۔ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے اور جوانی یونہی بیتی چلی جارہی ہے ۔۔۔ رنگینیوں کے بغیر۔۔۔ دل سے کوئی ہوک نہیں اٹھتی۔ جگر میں کوئی ٹیس نہیں ہوتی ۔۔۔ ہونٹ نہیں مسکراتے آنکھیں نہیں روتیں۔

جالا:۔ پھول پیدا ہوتا ہے خوشبو دینے کے لئے جنگل میں رہے یا باغ میں، شاخ پر رہے یا کسی کے بستر پر خوشبو دینا ہی رہیگا تو پھول ہے بنیلا جو حسن کی ٹہنی پر کھلا ہے۔ یہ خواہش نہ کر کہ تجھے کوئی توڑ کر مسل دے۔

بنیلا:۔ جو مستی شراب بھرے پیالے کے ٹوٹنے میں ہے بند صراحی میں نہیں ہے ۔۔۔ انگوروں کو مسل کر شراب بنائی جاتی ہے اور پھول جب مسلے جاتے ہیں تو ان سے عطر بنتا ہے۔

جالا:۔ دستار کے تار چھیڑ کر ۔ کل رات جو آیا تھا ۔۔۔ وہ پھول لے کر۔

بنیلا:۔ سب کے سب مرجھا گئے ۔۔۔ کون لیکر آیا تھا ۔ کب آیا تھا مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔ مجھے نیند آرہی تھی ۔ کیا پھر آئے گا۔ نہیں مجھے کچھ نہ بتاؤ۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتی ۔ لاؤ مجھے میری چوڑیاں دو۔

(جالا چوڑیاں دیتی ہے)

بنیلا:۔ جالا چوڑیاں کھنکھناتی ہیں پر میری زندگی کس قدر خاموش ہے۔ میری کتنی خواہش ہے کہ میری کشتی موجوں میں گھر کر تھپیڑ کھائے۔

جالا:۔ ہر دن نیا تھپیڑا ہے؟

بنیلا:۔نہیں جالا تو نہیں سمجھتی ـــــ دنیا میں ہر جگہ دیوتا آسمان سے اُتر کر عورتوں سے محبت کرتے رہے ہیں ـــــ میں کن آنکھوں سے ان کی راہ دیکھوں کن جنگلوں میں انہیں تلاش کروں۔ کونسی دعائیں مانگوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔ وہ یا تو مجھے جو کچھ سکھائیں یا سب کچھ بھلا دیں۔ اگر یہ دیوتا اپنے شبستانوں میں اوندھے پڑے رہے تو جالا کیا میں ایسا رفیق دیکھے بغیر مر جاؤں گی جو میری زندگی میں ہولناک حادثے برپا کر سکے۔

جالا:۔تیرے سپنے بڑے انوکھے ہیں۔

بنیلا:۔اور سب سے انوکھی بات یہ ہے کہ اگر کسی نے مجھ سے محبت کی تو میری سب سے بڑی خواہش یہ ہوگی کہ وہ میری محبت کے نیچے پس جائے۔ وہ لوگ جو اب میرے پاس آتے ہیں اس قابل نہیں کہ میری آنکھیں ان کے لئے ایک ننھا سا آنسو بھی اُگلیں ـــــ میری جوانی ایک ایسے ساتھی کی تلاش میں ہے۔ جو ساتھی سے کچھ زیادہ ہو ـــــ جو میری زندگی میں ہلچل مچا دے۔

جالا:۔تیری خواہش ضرور پوری ہوگی۔ پر مجھے ڈر ہے کہ کوئی بہت بڑا حادثہ برپا ہوگا ـــــ سمندر کی زبان جب خاموش ہو تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بہت بڑا طوفان کا پیغام دے رہی ہے۔

بنیلا:۔وہ طوفان کب آئے گا جالا۔۔

جالا:۔جب دو الگ الگ رستوں پہ چلنے والے ستارے آپس میں ٹکرا جائیں گے۔

مخالف سمت چلنے والا ستارہ دیوتا صنم تراش تھا ـــــ مصر کی ملکہ اس خوبصورت نوجوان کی محبت میں گرفتار تھی اس لحاظ سے وہ وادیٔ نیل کا مالک تھا۔

مصر کے سب سے بڑے معبد کے لئے حسن و عشق کی مورتی اسی چابک دست بت ساز نے تیار کی تھی ـــــ اس کا حسن اور اس کی صنعت دونوں پوجے جاتے تھے اس کی بنائی ہوئی مورتی پر مصر کی حسین ترین عورتیں رنگا رنگ کے پھول قسم قسم کے پھل اور سمرنا کی کبوتریاں چڑھا یا کرتی تھیں۔ جن کے پر ناز دادا کے مانند اُجلے اور پیر بوسوں کے مانند سُرخ ہوتے تھے ـــــ وادیٔ نیل کی ہر دوشیزہ اپنی کتاب محبت دیوتا کے اس بت کے سامنے کھولنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ یوں کہئے کہ مصر کا یہ حسین بت تراش وہاں کی ہر عورت کے دل میں دھڑکن بن کر سمایا ہوا تھا۔

جس راستے سے اس کا گزر ہوتا تھا اس پر کئی پرستار عورتیں اپنا نام لکھ دیتی تھیں۔ اور وہ ان کو پڑھے بغیر گزر جاتا تھا۔ اس کی ڈھیلی قبا ان ناموں کو اکثر مٹا دیا کرتی تھی۔ اگر کسی روز وہ مسلے ہوئے پھول کی پتیاں بکھیرتا ہوا آگے بڑھ جاتا تو عورتیں ان پر ٹوٹ پڑتی تھیں۔ اور تبرک کے طور پر اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیتی تھیں۔

اُس کے پاس دولت تھی حسن تھا۔ جوانی تھی۔ ملکۂ مصر اس کی ایک ادنیٰ کنیز تھی۔ مگر وہ ناخوش تھا۔ وہ خود کو ایک ایسی کھیتی سمجھتا تھا جو مسلسل بارش کے باعث دلدل بن جائے۔ وہ محبت کئے جانے سے گھبرا کر خود محبت کرنا چاہتا تھا اور آج اپنی خیالات میں غرق دریائے نیل کے کنارے ڈوبتے

ہوئے سورج میں اپنی موجودہ زندگی کا عکس دیکھ رہا تھا کہ بنیلا زیورات سے لدی پھندی اپنی چال سے آپ ہی مست ہوئی اُس کے پاس سے گزری۔

دیمتا نے منہ پھیر لیا۔ بنیلا کے گہنوں سے اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ کوئی طوائف ہے اس لئے اس کے سلام سے بچنے کے لئے اپنا منہ موڑ لیا تھا وہ اس کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مصر کی حسین عورتوں کے بے نقاب چہرے دیکھ دیکھ کر وہ اکتا چکا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کے دل میں اکساہٹ پیدا ہوئی اور اس نے کنکھیوں سے بنیلا کی طرف دیکھا۔ جو چہرے پر زرد رنگ کی نقاب ڈالے دریائے نیل کے زرنگار پانی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا اُس نے مصر کے سب سے بڑے بت ساز کی موجودگی کی پروا تک نہ کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف ہوا میں تازگی اور ٹھنڈک ڈھونڈ رہی ہے اور شام کی فضاء کے ارتعاش سے اپنا دل بہلانا چاہتی ہے۔

دیمتا کے سینے میں ہیجان پیدا ہو گیا — یہ عورت اس وقت نیل کے کنارے کیا کرنے آئی تھی — کسے ڈھونڈ رہی تھی — اس کو دیکھ کر اس کے قدم رُک کیوں نہ گئے — اس نے یقیناً اسے دیکھا تھا۔ جب وہ اس کے پاس سے گزری تھی تو اسے ملکۂ مصر کے محبوب کی موجودگی کا علم تھا۔ مگر وہ آداب بجا لائے بغیر بے پروا ہوا کے مانند پاس سے گزر گئی — کیوں — کیوں — وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بنیلا بولی — اسی دلکش انداز سے — دیمتا سے نہ رہا گیا — وہ آگے بڑھا اور اس سے مخاطب ہوا۔

دیمتا:۔ اے تیز رو حسینہ میرا سلام قبول کر۔

بنیلا:۔ کر لیا۔

دیبتا:۔ یہ تیز قدم تجھے کدھر لئے جارہے ہیں؟

بنیلا:۔ واپس!

دیبتا:۔ بالکل اکیلی۔

بنیلا:۔ بالکل اکیلی۔

دیبتا:۔ اپنے شوہر کے پاس۔

(بنیلا قہقہہ لگا کر ہنستی ہے)

دیبتا:۔ سورج دریائے نیلی میں غوطہ لگا گیا ہے۔ اب اندھیرے میں کسے ڈھونڈ رہی ہے۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں۔

بنیلا:۔ مجھے کسی کی تلاش نہیں — میں اکیلی سیر کے لئے نکلی ہوں۔

دیبتا:۔ لیکن یہ زیور تو نے صرف اپنا دل خوش کرنے کے لئے نہیں پہنے — اور یہ پہلا نقاب۔

بنیلا:۔ میں نے یہ زیور صرف اپنی خوشی کے لئے پہنے ہیں۔ اس لئے کہ یہ بتاتے ہیں۔ میں خوبصورت ہوں اور چلتے ہوئے میں اپنی نازک انگلیوں کی طرف دیکھتی ہوں۔ جو ان انگوٹھیوں کی شان دوبالا کرتی ہیں۔

دیبتا:۔ تیرے ان ہاتھوں میں ایک آئینہ ہونا چاہئیے جس میں تو صرف اپنی آنکھیں دیکھتی رہے — یہ آنکھیں — اُف یہ آنکھیں۔

بنیلا:۔ ان آنکھوں میں اب نیند آگئی ہے — میں تھک کر چور ہو گئی ہوں۔

مجھے اب جانا چاہیئے۔

دیبیتا:۔ کس راستے سے کدھر؟

بینیلا:۔ میں ہرگز نہیں بتاؤں گی — واہ، تو نے مجھ سے یہ پوچھا تک نہیں کہ اس میں میری خوشی ہے کہ نہیں — کس راستے سے؟ کدھر — کیا بے تکلفی سے تو نے یہ کہہ دیا — کیا تو سمجھتا ہے کہ میں ایک بازاری عورت ہوں — تجھے معلوم ہے کہ مصر میں کن کن دروازوں پر میرا استقبال ہوتا ہے — تو نے کیا وہ تمام آدمی شمار کئے ہیں جو بینیلا کے التفات کو سرمایۂ حیات سمجھتے ہیں — کس راستے سے کدھر — میں تجھے ہرگز نہیں بتاؤں گی یہیں کھڑا رہ یا چلا جا۔ میری ہمرکابی کا شرف تجھے ہرگز نصیب نہ ہوگا۔

دیبیتا:۔ تو شاید نہیں جانتی کہ میں کون ہوں؟

بینیلا:۔ میں تجھے اچھی طرح جانتی ہوں — تو دیبیتا سنگتراش ہے۔ تیرے ہاتھوں نے اس دیوی کی مورتی تیار کی ہے جس کو میں پوجتی ہوں تو ملکۂ مصر کا عاشق ہے اور اس شہر کا مالک، پر میری نظروں میں تو ایک حسین غلام ہے۔ اس لئے کہ آج تو نے مجھے دیکھ لیا ہے اور میری محبت میں گرفتار ہو گیا ہے — میری طرف یوں گھور گھور کے نہ دیکھ۔ کچھ کہنے کی کوشش نہ کر، میں جانتی ہوں تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ تو نے آج تک کسی سے محبت نہیں کی بلکہ تجھ سے

محبت کی جاتی رہی ہے ـــــ پر اب تو میری محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ اس وقت سر جھکائے تو میری گھنی پلکوں کی خوبصورتی پر غور کر رہا ہے۔ اور یہ سوچتا ہے کہ میرے ہونٹ کتنے نازک ہیں۔ میرے بال کس قدر ملائم ہیں۔ جن بالوں پر تو آج غور کرتا ہے ان پر لاکھوں آدمی ایک زمانے سے غور کر رہے ہیں۔ میرے حُسن کے چرچے مصر کے ذرے ذرے کی زبان پر ہیں۔ پچھلے برس میں نے بیس ہزار آدمیوں کے سامنے رقص کیا اور مجھے معلوم ہے کہ تو ان خوش قسمت آدمیوں میں موجود نہیں تھا ـــــ کیا تو سمجھتا ہے کہ میں اپنے آپ کو چھپاتی ہوں ـــــ نہیں ـــــ سب میرے چندھیا دینے والے حُسن کی بہار دیکھ چکے ہیں ـــــ لیکن تو ـــــ ایک طرف تو مجھے پھر کبھی نہیں دیکھے گا۔ جو کچھ کہ میں ہوں۔ جو کچھ کہ میں محسوس کرتی ہوں میری محبت میرے حُسن کی بابت تو کچھ بھی نہ جان سکے گا ـــــ تو ایک حقیر، لیبت، چھچھورا، ظالم بے حس اور بزدل انسان ہے ـــــ مجھے حیرت ہے کہ ابھی تک کسی عورت کے دل میں اتنی نفرت کیوں پیدا نہیں ہوئی کہ وہ تجھے اور ملکۂ مصر دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دے۔

(دیتیا اور بتیلا چند لمحات کے لئے خاموش کھڑے رہتے ہیں)

دیتیا:۔ دیتیا کے ساتھ چلنے سے انکار کر کے جو تو نے شان پیدا کی ہے بالآخر تیرے لئے بہت مہنگی ثابت ہو گی ـــــ میں پوچھتا ہوں۔ تجھے ڈر کس بات کا ہے۔

بنیلا:۔ تو جو کہ دوسروں کی محبت کا عادی ہے کیا بتا سکتا ہے کہ اس عورت کو کیا دینا چاہئیے جو محبت نہیں کرتی۔

دیتیا:۔ میں تیرے قدموں پر مصر کا سارا سونا ڈھیر کر دوں گا۔

بنیلا:۔ اس سے زیادہ سونا میرے بالوں میں ہے ___ مجھے سونا نہیں چاہئیے مجھے صرف تین چیزوں کی خواہش ہے کیا دے سکتا ہے۔

دیتیا:۔ بول وہ تین چیزیں کیا ہیں؟

بنیلا:۔ مجھے چاندی کا ایک آئینہ چاہئیے کہ اس میں ہر روز اپنی آنکھوں کا خمار دیکھا کروں۔

دیتیا:۔ تجھے مل جائے گا۔ بول جلدی بول باقی دو چیزیں کیا ہیں؟

بنیلا:۔ مجھے ہاتھی دانت کی ایک کنگھی چاہئیے جو میرے بالوں میں اس طرح لگائے جیسے کرنوں بھرے پانی میں ماہی گیروں کے جال۔

دیتیا:۔ تیسری چیز؟

بنیلا:۔ موتیوں کی ایک مالا جسے پہن کر میں تیرے لئے سہاگ کا ناچ ناچوں گی۔

دیتیا:۔ بس؟

بنیلا:۔ مجھے یہ مالا مل جائے گی نا؟

دیتیا:۔ جیسے تو چاہے گی۔

بنیلا:۔ جیسی میں چاہوں گی۔ میں بھی یہی کہنا چاہتی تھی۔ بول اب میں کیا اپنے تحفے انتخاب کروں؟

دمیتا:۔ کیوں نہیں۔

بنیلا:۔ کیا تو قسم کھاتا ہے کہ مجھے یہ چیزیں لا دے گا؟

دمیتا:۔ میں قسم کھاتا ہوں۔

بنیلا:۔ کس کی؟

دمیتا:۔ جس کی تو کہے۔

بنیلا:۔ حسن و عشق کی اس دیوی کی قسم کھا جس کی مورتی تو نے تیار کی ہے۔

دمیتا:۔ میں اسی کی قسم کھاتا ہوں۔

بنیلا:۔ تو میں نے اپنے تحفے چن لئے۔

دمیتا:۔ اتنی جلدی۔

بنیلا:۔ واقعی میں نے اپنے تحفے بہت جلدی چنے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں چاندی کا کوئی ایسا آئینہ قبول کر لوں گی جو مصر کے بنجارے بازاروں میں بیچتے پھرتے ہیں ــ مجھے وہ آئینہ چاہیئے جس میں یونان کی مشہور شاعرہ سیفو اپنا چہرہ دیکھتی رہی ہے ۔ اور جو اب یہاں کی مشہور طوائف سارہ کے پاس ہے وہ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے ۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تو اسے چرا لائے گا۔

دمیتا:۔ یہ سراسر دیوانگی ہے ــ تو چاہتی ہے کہ میں چوری کروں۔

بنیلا:۔ میں یہ سمجھتی تھی کہ مرد اپنے قول پر قائم رہا کرتے ہیں۔

دمیتا:۔ میں اپنے قول پر قائم ہوں ــ آگے بول۔

بنیلا:۔ اور یہ جو ہاتھی دانت کی کنگھی ہا میں تجھ سے مانگ رہی ہوں معمولی کنگھی

نہیں —— یہ وہ کنگھی ہے جو یہاں کے سب سے بڑے کاہن کی بیوی اپنے بالوں میں لگائے رکھتی ہے۔ یہ کنگھی اُس ملکہ کے پاس تھی جو آج سے پانچ سو برس پہلے وادی نیل پر حکمران تھی۔

دمیتا:۔ پر میں یہ حاصل کیسے کروں گا؟

بنیلا:۔ اس کو قتل کر کے —— یہ کنگھی مجھے کل دوسرے تحفوں سمیت مل جانی چاہیئے۔

دمیتا:۔ پہلے چوری پھر قتل —— چلو ایسا ہی سہی۔

بنیلا:۔ تیسرا تحفہ موتیوں کی وہ مالا ہے جو تیرے ہاتھ کی بنائی مورتی کے گلے میں پڑی رہتی ہے۔

دمیتا:۔ تو حد سے بڑھ گئی ہے بنیلا —— سن لے، تجھے کچھ نہیں ملے گا۔ نہ آئینہ، نہ کنگھی اور نہ موتیوں کی مالا —— تو میرے جذبات کے ساتھ زیادہ دیر تک نہیں کھیل سکتی۔

بنیلا:۔ تیری زبان جو کچھ کہتی ہے۔ اس کو تیرا دل نہیں مانتا۔ اپنے آپ کو دھوکا نہ دے —— یہ تینوں تحفے تو کل مجھے یقیناً لا دے گا۔ پھر تو میرے پاس آیا کرے گا —— ہر شام کو —— اور میں مقررہ وقت پر سولہ سنگھار کئے تیری راہ دیکھا کروں گی —— میرا لباس تیری مرضی کے مطابق ہو گا۔ میرے بال تیری خواہش کے مطابق گوندھے جائیں گے۔ میں تیرے پیار کے لئے تیار رہا کروں گی جیسے سیپی سمندر کی گود میں بارش کے قطرے پینے کے

لئے تیار رہتی ہے ــــ اگر تو نرم و نازک محبت چاہے گا تو میں تجھے بچوں کی مانند کھلاؤں گی۔ اگر تو چاہے گا کہ میں خاموش رہوں تو میں چاندنی راتوں کی طرح چپ چاپ رہوں گی اور جب تیری خوشی ہو گی کہ میں گاؤں تو تیرے کان ٹھک ٹھک کے گیت سنیں گے۔ مجھے ایسے گیت یاد ہیں جو چشموں کے آبی نغموں سے بھی دھیمے ہیں۔ اور ایسے گیت بھی یاد ہیں جو کڑکتی بجلی سے بھی زیادہ خوفناک ہیں۔ مجھے ایسی سیدھی سادی اور تر و تازہ بولیاں بھی آتی ہیں۔ جو کنواری لڑکیاں اپنی ماؤں کو سنا سکتی ہیں اور ایسی غزلیں بھی یاد ہیں جو صرف تنہائی میں سنی جاتی ہیں اگر تو کہے گا تو رات رات بھر میں تیرے حضور میں ناچوں گی۔ ایسے ناچ جو تیتلیوں کو تھرکنا بھلا دیں اور عود کے دھوئیں کو پریشان کر دیں۔ ملکہ مصر دولت مند ہے مگر اس کے محل کے اندر ایسا کوئی بھی کمرہ نہیں جو میرے حجرہ خاص کا مقابلہ کر سکے ــــ اس کے اندر سجاوٹ اور زیبائش کے ایسے سامان ہیں۔ جن کی تعریف کے لئے۔ بڑے بڑے شاعر آج تک لفظ نہیں ڈھونڈ سکے ــــ اور تو جانتا ہے سب سے بڑی سجاوٹ کون ہے۔

نبیلا جس سے تو محبت کرتا ہے۔ پر اُسے ابھی طرح نہیں جانتا ــــ تو نے صرف میرا حسین چہرہ دیکھا ہے لیکن تو نہیں جانتا کہ میں ساری کی ساری حسین ہوں ــــ دیوتا ایک نہیں ایسے ہزاروں تعجب تجھے ہر روز ہوں گے۔ جب ہر بار تجھ پر میرا حسن ایک نئی چیز کا انکشاف کرے گا۔ آہ! تو مجھ سے کس قدر والہانہ محبت کرے گا ــــ

میری بانہوں میں فرطِ مسرت سے تو کیسے کانپ اٹھے گا ——
مجھے یقین نہیں آتا کہ تو نے وہ فضول سی کنگھی لانے سے انکار کر دیا ہے
جب کہ میرے سنہرے بالوں کی ساری لٹیں تیرے شانوں پر بل کھایا
کریں گی —— نہیں ابھی نہیں —— اس وقت تو نہیں ہاتھ لگانے
کا حقدار نہیں۔ کل —— کل ——

دمیتا:۔ ہاں کل —— کل تینوں تحفے تیرے قدموں میں ہوں گے۔

بنیلا:۔ اور اگر تو میرے لئے موتیوں کی وہ مالا بھی لے آیا جو عشق کی مورتی
کے گلے میں پڑی ہے تو میں تجھے بتاؤں گی کہ میرے ہونٹوں میں
اتنے بوسے ہیں جتنے سات سمندروں میں موتی —— لو اب کل
ملیں گے ——

کل...... یعنی دوسرے دن دمیتا صنم تراش کو ایک عورت کے
لئے جس کے حسن نے اس کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دی۔ تین
عجیب و غریب تحفے لے جانا تھے —— مصر کی حسین ترین عورتوں
پر راج کرنے والا ایک غلام بن کے رہ گیا تھا اگر بنیلا اس کے دل و
دماغ پر پوری طرح نہ چھا گئی ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ وہ اس عورت
کی عجیب و غریب خواہشات کو —— دریائے نیل کی لہریں
سمجھتا جو پتھریلے ساحل کے ساتھ ٹکرائی ہیں سادہ جھاگ بن کر
لوٹ جاتی ہیں۔ مگر وہ بنیلا کے حسن کی تیز و تند لہروں میں بہہ گیا تھا اور دیتا

چلا جا رہا تھا۔ یہ سیلاب بیشتر اس کے کہ وہ سنبھلنے پائے اُسے مصر کے سب سے بڑے کاہن کی بیوی کی خوابگاہ تک لے گیا اور اس نے وہ کام کیا جس کا اُسے وہم و گمان بھی نہ تھا۔۔ کنگھی حاصل کرنے کے لئے اُسے کاہن کی بیوی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا پڑے۔ جب دیبتا نے اس عورت کے سینے میں زہریلی سوئی چبھوئی تو اس کا دل اس حسرت سے دھڑکتا دھڑکتا بند ہو گیا کہ اس کا قاتل مصر کا وہ حسین نوجوان ہے جس کے دیدار کے لئے وہ اپنی سو جانیں بھی قربان کرنے کے لئے تیار تھی۔۔ کنگھی حاصل کرنے کے بعد، یعنی اپنے عشق کی پہلی خونین منزل طے کر کے دیبتا نے بڑی صفائی سے مشہور رقاصہ سارہ کے مکان سے چاندی کا وہ آئینہ چرایا جس میں شعلہ نفس شاعرہ سیفو اپنے روئے نگار دیکھا کرتی تھی۔۔ شبہ ایک جوان سال لڑکی پر کیا جس کے شباب کا شعلۂ اولین بھی لپکنے نہ پایا تھا۔ اس دوشیزہ کو اس جرم میں سولی پر چڑھا دیا گیا۔۔ بنیلا کے عشق کو دیبتا نے خون کا یہ دوسرا گھونٹ پلایا اور موتیوں کی وہ مالا لینے کے لئے روانہ ہو گیا جو اس کی بنائی ہوئی مورتی کے گلے میں پڑی تھی یہ اس نے کانپتے ہوئے حسن و عشق کی مورتی کے گلے سے جدا کی اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے رات کے آسمان کی پیشانی سے تاروں کی ساری افشاں چھین لی ہے دیوی کی اس بے حرمتی پر اُسے افسوس ہوا مگر بنیلا اس سے بڑی دیوی تھی۔۔ اب تینوں تحفے اس کے پاس تھے اور جب انہیں

ساتھ لے کر بنیلا سے ملنے گیا تو اسے یقین تھا کہ وہ اسے کسی نئے اور کڑے امتحان میں ڈال دے گی ــــ وہ اس کے لئے تیار تھا۔

بنیلا:۔ لے آیا میرے تحفے ــــ تو لے آیا میرے تحفے ــ مجھے یقین تھا کہ تو خالی ہاتھ کبھی نہ ملنے آئے گا۔
دمبیتا:۔ اس لئے کہ تیرے حکم کی تعمیل لازم تھی۔
بنیلا:۔ آہ دمبیتا میرے پیارے دمبیتا تو کتنا اچھا ہے ــــ جو کچھ اس وقت مجھے محسوس ہوتا ہے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا ــــ مقدس دیوتاؤں کی قسم مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ محبت کیا ہے ــــ پیارے اب میں تجھے اس سے کہیں زیادہ محبت دوں گی جس کا میں نے تجھ سے کل وعدہ کیا تھا ــــ وہ عورت جو سمندر میں ٹھوس چٹان کی مانند کھڑی تھی آج پاش پاش ہو گئی ہے۔

بوڑھے آسمان نے شاید ہی ایسا انقلاب دیکھا ہو ــــ تو یہ سمجھتا ہو گا کہ میں تجھ سے صرف محبت کروں گی ــــ نہیں آج میں اپنے حسن کی تمام خوبیاں تیری نذر کرتی ہوں اپنی ساری معصومیت تیری بھینٹ چڑھاتی ہوں۔ اپنی کنواری روح کی تمام پکیاہٹیں تیرے حوالے کرتی ہوں ــــ آ ــــ اب یہ شہر چھوڑ کر کچھ عرصہ کے لئے کہیں بھاگ جائیں۔ کسی ایسی جگہ جا رہیں جہاں تیرے میرے سوا اور کوئی نہ ہو ــــ کوئی نہ ہو ــ جہاں ہم ایسے دن گزاریں جن پر سہاگ کی راتیں

رشک کریں۔ عشق و محبت کی تاریخ میں شاید ہی ایسے کارنامے کا ذکر ہو جو کہ تو نے میرے لئے سرانجام دیا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اس روئے زمین پر مجھ ایسی والہانہ محبت کرنے والی پیدا ہوئی ہے اور نہ ہوگی ——— پر تیرے ہونٹوں پر یہ مہر خاموشی کیوں لگی ہے۔ تو بولتا کیوں نہیں۔

دمیتا:- میں کیا بولوں ——— حیرت مجھے نہ جانے کہاں بہالے گئی ہے ——— میں سمجھتا تھا آسمان بہت اونچا ہے۔ پر اس وقت وہ مجھے زمین پر لیٹا دکھائی دے رہا ہے۔

بنیلا:- یہ تو نے کیا کہا ——— یہ تو نے کیا کہا۔

دمیتا:- میں کہتا ہوں الوداع ——— الوداع۔

بنیلا:- الوداع ——— یہ میں کیا سن رہی ہوں دمیتا ——— یہ تین تحفے تو نے اتنی مشکلوں سے صرف اس لئے حاصل کئے تھے کہ مجھے اور میری محبت کو الوداع کہہ دے۔

دمیتا:- مجھے اپنا وعدہ پورا کرنا تھا سو میں نے کر دیا۔

بنیلا:- میں سمجھی نہیں۔

دمیتا:- تو سمجھے یا نہ سمجھے مجھے اب اس سے کوئی سروکار نہیں یہ چھوٹا سا اسرار، یہ ننھی سی گتھی اب تیرے ناخن تدبر کے لئے چھوڑ رہا ہوں ——— الوداع۔

بنیلا:- دمیتا ——— دمیتا ——— یہ میں کیا سن رہی ہوں ——— یہ لہجہ

کہاں سے پیدا ہو گیا — کیا سچ مچ یہ لفظ تیری زبان سے نکلے ہیں — مجھے کچھ تو بتا — آخر ہوا کیا۔

دمینتا:۔ کیا میں ایک ہی بات ہزار بار دہراؤں۔ تیرے ہی لئے ہاتھی دانت کی کنگھی لانے کے لئے میں نے کاہن کی بیوی کو قتل کیا۔ تیرے ہی لئے میں نے سارہ کے یہاں سے آئینہ چرایا اور اصل مجرم کے لئے بجائے ایک معصوم دوشیزہ پھانسی پر چڑھا دی گئی۔ تیرے ہی لئے میں نے حسن و عشق کی مورتی کے گلے سے موتیوں کا ست لڑا ہار اتارا۔ یہ تینوں تحفے مجھے تیرے حضور میں حاضر کرنا تھے۔ جن کے عوض میں تیری طرف سے مجھے صرف ایک چیز ملنی تھی — تیری التفات — اس وقت میں نے یہ سودا بہت مہنگے داموں پر قبول کر لیا۔ لیکن اب مجھے اس جنس کی قدر و قیمت معلوم ہو گئی ہے۔ جسے میں خرید رہا تھا۔ اب میں تجھ سے کچھ نہیں مانگتا — تو بھی ٹھیک اسی طرح مجھ سے کچھ طلب نہ کر اور چپ چاپ چلی جا — مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایسی سیدھی سادی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی۔

بنیلا:۔ اگر یہی بات ہے تو یہ تحفے اپنے پاس رکھ — کیا تو سمجھتا ہے کہ مجھے ان کی ضرورت ہے — نہیں میں تو صرف تجھے چاہتی ہوں۔

— صرف تجھے —

دمینتا:۔ مجھے معلوم ہے — مگر میں اب تجھے نہیں چاہتا اور چونکہ ایسے معاملوں میں طرفین کی رضامندی ضروری ہوتی ہے اس

لئے ہمارا ملاپ ناممکن ہے ـــــ میں نے کھلے الفاظ میں تجھے سمجھانے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ میں اپنے دل کی بات تجھ پر واضح نہیں کر سکا۔ دراصل مجھ میں اتنی قدرت بھی نہیں ہے کہ تجھے اچھی طرح سمجھا سکوں اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ تو اس حقیقت کو جیسی بھی ہے قبول کر لے ـــــ تو یہ راکھ کریدنا چاہتی ہے اس یقین کے ساتھ کہ یہ راکھ نہیں ہو سکتی ایسی حالت میں ہماری گفتگو سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

بنیلا: میری طرف سے لوگوں نے یقیناً تیرے کان بھرے ہیں۔

دمیتا:۔ تیرے شکوک بے بنیاد ہیں۔

بنیلا:۔ نہیں نہیں۔ میں سب جانتی ہوں ـــــ مجھے سب کچھ معلوم ہے لوگوں نے ضرور میرے بارے میں زہر اگلا ہے ـــــ انکار نہ کر ـــــ وادیٔ نیل میں اتنے ذرّے نہیں جتنے کہ میرے دشمن ہیں ـــــ میرے خلاف یقیناً تجھ سے کہا گیا ہے لیکن دمیتا، تجھے ان کی زہریلی باتیں ہرگز نہیں سننا چاہیئے تھیں یقین مقدس دیوتاؤں کی قسم جو کچھ تجھ سے کہا گیا ہے سفید جھوٹ ہے۔

دمیتا:۔ مجھ سے تیرے خلاف کسی نے کچھ نہیں کہا۔

بنیلا:۔ دمیتا تو نے یہ نہیں سوچا کہ میں تجھے دھوکا دے ہی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ میں تجھ سے سوائے تیرے اور کسی چیز کی طالب نہیں تو پہلا آدمی ہے جس سے میں نے ان الفاظ میں

گفتگو کی ہے۔

دمینتا:۔ایسی باتوں کا وقت گزر چکا ہے ـــــ ایک بار تو میری ہو چکی ہے۔
ایک دفعہ میں تجھے اپنا بنا چکا ہوں۔

بنیلا:۔کب، کہاں، کیسے، ـــــ یہ تو کیسی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔

دمینتا:۔میں سچ کہتا ہوں ـــــ تجھے اپنائے بغیر میں تجھے اپنا بنا چکا ہوں تجھ سے جو کچھ چاہتا تھا۔غیر ارادی طور پر تو نے مجھے دے دیا ہے ـــــ تو مجھے خوابوں کی دنیا میں لے گئی۔میں مانتا ہوں، پر اب اُس دنیا میں واپس جا کر اُس حسن اور خوبصورتی کا نظارہ کرنے کی مجھ میں تاب نہیں۔اور نہ تو مجھے اُس دنیا میں پھر لے جا سکتی ہے ـــــ ایک راستے پر مسرّت اور شادمانی سے دو مرتبہ ملاقات نہیں ہوا کرتی ـــــ ہم ایک سڑک پر مخالف سمتوں سے آ رہے تھے۔تھوڑی دیر ہمارے قدم رُک گئے مگر اب ہمیں جُدا ہونا چاہیئے ـــــ تیرا راستہ اِدھر ہے اور میرا اُدھر۔

بنیلا:۔صرف ایک ہی نظارے سے تیری نگاہیں سیر ہو گئیں ـــــ ایک ہی بار خوابوں کی دنیا میں جا کر تیرا جی بھر گیا ـــــ پھولوں بھرے باغ میں جا کر تو ایک ہی کلی پر قناعت کر گیا۔

دمینتا:۔تو اصلیت کے قریب پہنچ گئی ہے ـــــ میں ایک ہی نظارے خوابوں کی دنیا کی ایک ہی سیر اور پھولوں بھرے باغ کی ایک ہی کلی پر قانع رہنا چاہتا ہوں۔اس لئے کہ میں اُس

نظارے کے حسین تخیّل، اس سیر کی مسرت بخش یاد اور اس کلی کی پیاری مہک کو اپنے دل و دماغ میں قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے تیری تصویر کو جس سنہرے فریم میں دیکھا ہے۔ اُسے بدلنے کی کوشش نہ کر۔

بنیلا:۔ اور میرے —— میرے متعلق تو کیا کہتا ہے جو اتنی بھیانک باتیں سننے پر بھی تجھ سے محبت کرتی ہے —— کیا میں نے وہ خواب دیکھا ہے جس کا ذکر تو بار بار کرتا ہے اور کیا میں اس مسرت اور شادمانی کی گھڑیوں میں تیری شریک رہی جو تو نے مجھ سے چرائی ہیں —— ہاں چرائی ہیں —!

دمیتا:۔ کیا اس وقت تجھے میرا خیال تھا۔ جب میری کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر تو نے مجھ سے تین شرمناک فعل کرائے —— تین شرمناک فعل جو ساری زندگی مجھے تین مہیب دیو بن کر ڈراتے رہیں گے —— صرف ایک لمحہ کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر تو نے مجھ سے تین احکام منوائے جو میری زندگی کو پاش پاش کر سکتے تھے۔

بنیلا:۔ میں نے یہ صرف اس لئے کیا کہ تو میرا ہو جائے —— سارے کا سارا میرا —— تیری ہو کر میں تجھے اپنا کبھی نہ بنا سکتی۔

دمیتا:۔ تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی۔ لیکن صرف چند لمحات کے لئے —— تو نے مجھے اپنا غلام بنانا چاہا۔ پر اب میں تیری غلامی سے

آزاد ہونا چاہتا ہوں۔

بنیلا:۔ دمیتا تو کسی کا غلام نہیں میں تیری کنیز ہوں۔

دمیتا:۔ ہم میں سے وہی دوسرے کا غلام ہے جو کہ محبت کرتا ہے .... غلامی .... یہ عشق کا دوسرا نام ہے ..... تم سب عورتوں کے دل و دماغ میں ایک ہی خواہش ہوتی ہے کہ تمہاری کمزوری مرد کی طاقت پاش پاش کر دے اور تمہاری بے شعوری اس کی ذکاوت پر حکومت کرے۔ تم محبت کرنا یا محبت کئے جانا پسند نہیں کرتیں ــــ شباب کی آمد کے ساتھ ہی یہ خواہش تمہارے سینے میں کروٹیں لینے لگتی ہے کہ تم کسی مرد کو غلام بناؤ۔ اس کو ذلیل کرو اور سر جھکا کر اس پر اپنے چپل رکھ دو۔ پھر تم ہم لوگوں سے اپنی مرضی کے مطابق تلوار، تیشہ، قلم اور ہر وہ چیز جو تم پر قادر ہے چھین سکتی ہو، توڑ سکتی ہو ــــ اس وقت تم چاہو تو ہرکیولس پہلوان سے گرز لے کر اس کے ہاتھ میں چرخہ دے دو ــــ لیکن تم کسی مرد کی گردن جھکانے میں ناکام رہتی ہو تم ان ہاتھوں کو اچھا سمجھتی ہو۔ جو تمہارے گورے بدن پر تیل ڈالیں دیں۔ بس مرد کو دیوانہ وار چاہتی ہو جس کا سخت گھٹنا تمہاری گردن دباتا رہے ــــ حتیٰ کہ اس مرد سے بھی التفات کرتی ہو جو ہر روز تمہاری توہین کرے، وہ مرد جو تمہارے پاؤں چومنے سے انکار کرے تو تم اسے سر پر بٹھا لوگی ــــ وہ مرد جس کی آنکھیں تمہاری رخصت پر نمناک نہیں ہوتیں

تمہاری چوٹیا پکڑ کر جہاں چاہے تمہیں لے جا سکتا ہے۔ محبت زدہ عورت چونکہ تو غلام نہیں بنا سکی اس لئے تجھے غلامی قبول کرنا ہوگی۔

بنیلا:۔ دیبتا۔ تو مجھے مار پیٹ، میرا بدن نیلوں سے بھر دے مگر اس کے بعد مجھ سے محبت ضرور کر۔

دیبتا:۔ نہیں اب مجھے تجھ سے نفرت ہے۔

بنیلا:۔ تو جھوٹ کہتا ہے۔ تیری رُوح کے اندر میں سما چکی ہوں تو صرف ایک عورت کے سامنے جھکنے سے شرماتا ہے لیکن پیارے اگر صرف اتنی سی بات تیرے وقار کی تسکین کے لئے کافی ہے تو مجھے تیری غلامی قبول ہے۔ تجھے حاصل کرنے کے لئے میں اپنا سب کچھ دینے کو تیار ہوں۔ اس سے کہیں زیادہ جو تو نے اب تک مجھے دیا ہے.... بول میں تیرے لئے کیا قربانی کر سکتی ہوں۔ ایک بار تجھے اپنا بنا کر مجھے زندگی سے کوئی شکایت نہ رہے گی۔

دیبتا:۔ کیا تو قسم کھاتی ہے۔

بنیلا:۔ حسن و عشق کی دیوی کی قسم میں تیرے لئے ہر قربانی کرنے کو تیار ہوں۔

دیبتا:۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لے۔

بنیلا:۔ دیر نہ کر جلدی بول۔ تو مجھ سے کیسی قربانی چاہتا ہے۔

دمینتا:۔ بالکل معمولی۔ میں تجھ سے تیری طرح تین تحفے نہیں مانگتا۔ اس لئے کہ یہ رواج کے خلاف ہوگا ۔۔۔ لیکن میں تجھے تحفے قبول کرنے کے لئے ضرور کہہ سکتا ہوں ۔۔ کیا نہیں؟

بنیلا:۔ کیوں نہیں؟

دمینتا:۔ یہ آئینہ کنگھی اور ہار منگاتے وقت کیا تجھے ان کو استعمال کرنے کا خیال تھا۔

اس اپچوری کے آئینے، اس خون آلود کنگھی اور اس مقدس ہار کو ۔۔۔ یہ ایسے جواہرات نہیں ہیں کہ ان کی عام نمائش کی جائے..۔

بنیلا:۔ بہت دور کی سوجھی۔

دمینتا:۔ پہلے میرا ایسا خیال نہیں تھا۔ مگر اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو نے محض ظلم ڈھانے کی خاطر مجھ سے تین جرم کرائے۔ تین جرم جن سے مصر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔

اب تجھے ان تحفوں کی عام نمائش کرنی ہوگی ۔۔۔ آئینہ ہاتھ میں لے کر کنگھی بالوں میں سجا کر اور ہار گلے میں پہن کر تو باغ میں سیر کے لئے جائے گی۔ لوگ تجھے دیکھیں گے اور فوراً ہی ملکہ کے سپاہیوں کے حوالے کر دیں گے ۔۔۔ لیکن تجھے وہ چیز مل جائے گی جس کی تجھے خواہش تھی اور میں سورج طلوع ہونے سے پہلے زندان میں تیری ملاقات کے لئے آؤں گا ۔۔۔ الوداع

جس طرح دیوتا اپنے وعدے پر قائم رہا اسی طرح بنیلا نے اپنا قول پورا کیا، چنانچہ اسی روز شام کو جب کہ سورج کی کرنیں دریائے نیل کی لہروں کو چوم رہی تھیں۔ بنیلا اٹھی اور اپنی بڑی خادمہ کو حکم دیا کہ وہ اُسے اچھی طرح سے سجائے، سج سجا کر اس نے اپنے سنہرے بالوں میں کنگھی جمائی گلے میں ست لڑا ہار پہنا اور ہاتھ میں آئینہ لے کر باغ عامہ کی سیر کو چل دی۔

لوگوں نے وہ تین چیزیں دیکھیں جن کے گم ہو جانے پر سارے مصر میں ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ اور حیرت میں غرق ہو گئے بعض عورتیں اس نظارے کی تاب نہ لا سکیں۔ اور بنیلا کے خوفناک انجام نے ان پر کپکپی طاری کر دی مگر بنیلا کے قدم پہلے سے زیادہ مضبوط تھے۔ باغ کی پتھریلی روشوں پر چلتے ہوئے وہ سنگ مرمر کا ایک حسین مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔

فوراً ہی آگ کی طرح یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی کہ حسن و عشق کی مقدس دیوی کا ست لڑا ہار۔ سارہ کا آئینہ جس میں سیفو اپنا چہرہ دیکھا کرتی تھی۔ اور کاہن کی بیوی کی کنگھی بنیلا رقاصہ کے پاس ہے۔ چنانچہ بنیلا ابھی باغ کی تیسری روش ہی پر چلی تھی کہ ملکہ مصر کے سپاہیوں نے اُسے گرفتار کر لیا اور زندان میں قید کر دیا۔

ساری رات وہ اس اندھیرے زندان میں طرح طرح کے

ڈراؤنے خواب دیکھتی رہی۔ بار بار وہ کسی دہشت ناک خیال سے کانپ اُٹھتی۔

اسی ادھیڑ بن میں صبح ہوگئی اور حسب وعدہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ دمیتا زندان میں داخل ہوا اور اس کے پیچھے پیچھے جلّاد جس کے ہاتھ میں زہر کا پیالہ تھا۔ پیشتر اس کے کہ بنیلا دمیتا سے کچھ کہے زہر کا پیالہ اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔

محبت کا یہ آخری جام اس نے ہونٹوں سے لگایا اور سارا زہر غٹا غٹ پی گئی۔

زہر پینے کے بعد اس نے کنکھیوں سے دمیتا کی طرف دیکھا گویا وہ اس سے یہ کہنا چاہتی ہے "دیکھ موت کا بوسہ یوں لیا کرتے ہیں" مگر دمیتا نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔

زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔ اُس کے پاؤں دبا کر جلّاد نے پوچھا "کیا تجھے کچھ محسوس ہوا ؟"

بنیلا نے جواب دیا "نہیں !"

پھر جلّاد نے اس کے گھٹنے دبائے "اب"

پیشتر اس کے کہ بنیلا جواب دے وہ لڑکھڑا کر چوبی تخت پر گر پڑی۔ دمیتا سے آخری بار کچھ کہنے کے لئے اس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر زہر اپنا کام کر چکا تھا —— آخری بات اس کی زبان پر موت کی سردی نے منجمد کر دی اور وہ ہمیشہ کے لئے

فنا کی تاریکی میں سو گئی۔

کہتے ہیں بنیلا کی لاش کو سامنے رکھ کر دمیتا سنگ تراش نے مردہ حسن سے زندہ حسن پیدا کیا —— اس نے مصر کی اس حسین و جمیل رقاصہ کی تمام رعنائیاں پوشیدہ اور ظاہر —— سنگ مرمر کے ایک بت میں ہمیشہ کے لئے قید کر دیں۔

بنیلا کا مجسمہ جب تیار ہو گیا تو لوگوں نے اس کی زبان سے یہ لفظ سنے۔

"یہ عورت اب مجھ سے اور اپنے آپ سے کہیں زیادہ دیر تک زندہ رہے گی"

(ماخوذ)

مسز ڈی سلوا

بالکل آمنے سامنے فلیٹ تھے۔ ہمارے فلیٹ کا نمبر تیرہ تھا۔ اس کے فلیٹ کا چودہ۔ کبھی کوئی سامنے کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہو تو مجھے یہی معلوم ہوتا کہ ہمارے دروازے پر دستک ہو رہی ہے۔ اس غلط فہمی میں جب میں نے ایک بار دروازہ کھولا تو اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔

یوں تو اس سے پہلے کئی دفعہ میں اُسے سیڑھیوں میں، بازار میں اور بالکونی میں دیکھ چکی تھی۔ مگر کبھی بات کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور کہنے لگی "تم نے سمجھا کوئی تمہارے گھر آیا ہے"۔

میں بھی جواب میں مسکرا دی۔ چند لمحات تک وہ اپنے دروازے کی دہلیز میں اور میں اپنے دروازے کی دہلیز میں کھڑی رہی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے اور میں اُس سے اچھی طرح واقف ہو گئی۔

اس کا نام میری خدا معلوم کیا تھا۔ مگر اس کے خاوند کا نام پی۔ این۔ ڈی سلوا تھا چنانچہ میں اسے مسز ڈی سلوا ہی کہتی تھی۔ میں اسے میری ضرور کہتی مگر وہ

عمر میں مجھ سے کہیں بڑی تھی۔ موٹے موٹے نقش، چھوٹی گردن، اندر دھنسی ہوئی ناک پکوڑا سی، سر چھوٹا جس پر کٹے ہوئے بال ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ آنکھیں دوات کے منہ کی طرح کھلی رہتی تھیں۔ معلوم نہیں سوتے میں ان کی شکل کیسی ہوتی ہوگی؟

اس کا خاوند معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا۔ کسی دفتر میں کام کرتا تھا۔ جب شام کو گھر لوٹتا اور مجھے باہر بالکنی میں دیکھتا تو اپنے بھورے رنگ کا ہیٹ اتار کر مجھے سلام ضرور کرتا تھا۔ بے حد شریف آدمی تھا۔ مسز ڈی سلوا بھی بہت ملنسار اور با اخلاق عورت تھی۔ دونوں میاں بیوی پُرسکون زندگی بسر کرتے تھے۔

چار پانچ برس کا ایک لڑکا تھا۔ اس کو دیکھ کر کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باپ چھوٹا ہو گیا ہے اور کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ماں سکڑ گئی ہے۔ ماں باپ دونوں کے نقش کچھ اس طرح اس بچے میں خلط ملط ہو گئے تھے کہ آدمی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ماں پر ہے یا باپ پر۔

پانچ برس میں ان کے یہاں صرف یہی ایک بچہ ہوا تھا۔ مسز ڈی نے ایک روز مجھ سے کہا تھا "ہمارا ماں بھی اس موافق بچہ دیا کرتا تھا.... پانچ برس کے پیچھے ایک پہلے ہم ہوا۔ پانچ برس کے پیچھے ہمارا بھائی ہوا ——— اس کے پیچھے ہمارا ایک اور بہن"۔

پانچ برس کی قید چونکہ پوری ہو چکی تھی۔ اس لئے مسز ڈی سلوا اب پیٹ سے تھی۔ اس کا خاوند بہت خوش تھا۔ مجھے مسز ڈی سلوا نے بتایا کہ اپنی ڈاکٹری

میں اس نے کئی تاریخیں لکھ رکھی ہیں پہلے بچے کی پیدائش کی تاریخ ــــ ہونے والے بچے کی پیدائش کی تاریخ کا اندازہ اور وہ سال جس میں کہ تیسرا بچہ پیدا ہوگا...... یہ سارا حساب اس نے اپنی ڈائری میں درج کر رکھا تھا مسز ڈی سلوا کہتی تھی کہ اس کے خاوند کو پانچ برس کا یہ قیدہ اچھی معلوم نہیں ہوتی اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک بچہ پیدا کرنے کے بعد وہ پانچ برس کے لئے کیوں چھٹی پر چلی جاتی ہے۔ مسز ڈی سلوا خود حیران تھی مگر اسے فخر بھی تھی کہ وہ ماں کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔

میں بھی کم متحیر نہ تھی۔ سوچتی تھی یا الٰہی یہ پانچ برسوں کا چکر کیا ہے کیوں ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں بھول جاتا؟.... قدرت نے کیا اس عورت کے اندر ایسی مشین لگا دی ہے کہ جب پانچ سال کے پانچ چکر ختم ہو جاتے ہیں تو کھٹ سے بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ ہمارے پڑوس میں ایک عورت تھی جو ڈیڑھ برس سے پیٹ سے تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ اس کے رحم میں کوئی خرابی ہے۔ بچہ موجود ہے جو پیدا ہو جائے گا مگر اس کی نشو و نما تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد چونکہ رک جاتی ہے۔ اس لئے ابھی تک اتنا بڑا نہیں ہوا کہ پیدا ہو سکے۔

امی جان جب مجھ سے یہ باتیں سنتی تھیں تو کہا کرتی تھیں قیامت آنے والی ہے خدا جانے دنیا کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے کبھی ایسی باتیں سننے میں نہیں آتی تھیں عورتیں چپ چاپ نو مہینے کے بعد بچے جن دیا کرتی تھیں۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی تھیں۔ اب کسی کے بچہ ہونیوالا ہو تو سارے شہر کو خبر ہو جاتی ہے۔

مٹکا سا پیٹ لئے باہر جا رہی ہیں۔ سڑکوں پر گھوم رہی ہیں۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ مگر کیا مجال کہ ان کو ذرا سی بھی حیا آ جائے ..... آج کل تو دیدوں کا پانی ہی مر گیا ہے۔

میں یہ سنتی تھی تو دل ہی دل میں ہنستی تھی۔ امی جان کا پیٹ بھی کئی بار پھول کر مٹکا بن چکا تھا اور یہ مٹکا لئے وہ گھر کا سارا کام کاج کرتی تھیں ہر روز مارکیٹ جاتی تھیں مگر جب دوسروں کو دیکھتی تھیں یا انکے متعلق باتیں سنتی تھیں تو اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتی تھیں۔ دوسروں کی آنکھ کا تنکا انہیں فوراً نظر آ جاتا تھا۔

آدمی اگر اس مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو کیا اسے باہر آنا جانا بالکل بند کر دینا چاہیئے۔ مٹکا سا پیٹ لئے بس گھر میں بیٹھے رہو۔ صوفے پر اٹھو چارپائی پر لیٹ جاؤ چارپائی سے اٹھو تو کسی کرسی پر لیٹ جاؤ۔ مگر آفت تو یہ ہے کہ مٹکا سا پیٹ لئے بیٹھنے اور لیٹنے میں بھی تو تکلیف ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آدمی چلے پھرے تاکہ بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ یہ کیا کہ پیٹ میں بڑا سا فٹ بال ڈالے گھر کی چاردیواری میں قید رہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ امی جان جیا کیوں طاری کرنا چاہتی ہیں۔ بھئی اگر کوئی پیٹ سے ہے تو کیا اس کا قصور ہے؟ اس نے کوئی شرمناک بات کی ہے جو وہ شرم محسوس کرے۔

جب خدا کی طرف سے یہ مصیبت عورتوں پر عائد کر دی گئی ہے کہ وہ ایک مقررہ مدت تک بچے کو پیٹ میں رکھیں تو اس میں شرمانے اور لجانے کی بات ہی کیا ہے اور اسکا یہ مطلب بھی نہیں کہ سب کام چھوڑ کر آدمی بالکل نکما ہو جائے اسلئے کہ ماں بچہ پیدا کرتا ہے۔ بچہ پیدا ہوتا رہے۔ اب کیا ماں اس کے لئے باہر آنا جانا

موقوف کر دیا جائے لوگ ہنستے ہیں تو ہنسیں، کیا ان کے گھر میں ان کی مائیں اور بہنیں کبھی پیٹ سے نہیں ہوں گی۔ بھئی، مجھے تو امی جان کی یہ منطق بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ اصل میں انکی عادت یہ ہے کہ خواہ مخواہ ہر بات پر اپنا لکچر شروع کر دیتی ہیں خواہ کسی کو بُرا لگے یا اچھا۔ اپنی لڑکی کی بات ہو تو کبھی کچھ نہ کہیں گی۔ پچھلی دفعہ جب عارف میرے پیٹ میں تھا اور میں ہر روز اپولو بندر سیر کو جاتی تھی تو قسم لے لو جو اُن کے منہ سے میرے خلاف کچھ نکلا ہو، پر اب چونکہ بات مسز ڈی سلوا کی تھی جو بیچاری صرف اتوار کی صبح گرجا میں نماز پڑھنے اور شام کو سودا سلف لانے کے لئے اپنے خاوند کے ساتھ باہر نکلتی تھی۔ اس لئے امی جان کو تو "یہ ہے بیوی، تو یہ ہے بیوی" کہنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔

پہلے بچے پر پیٹ زیادہ نہیں پھولتا۔ لیکن دوسرے بچے کو چونکہ پھیلنے کے لئے زیادہ جگہ مل جاتی ہے۔ اس لئے پیٹ بہت بڑا ہو جاتا ہے۔

مسز ڈی سلوا لمبا سا جبہ پہنے جب گھر میں چلتی پھرتی تھی تو اس کا پیٹ بہت بدنما معلوم ہوتا تھا۔ قد اس کا چھوٹا تھا۔ پنڈلیاں جو بہت پتلی تھیں اور جبے کے نیچے آہستہ آہستہ حرکت کرتی تھیں۔ بہت ہی بھدی تصویر پیش کرتی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھڑونچی پر مٹکا رکھا ہے۔ سارا دن اس ڈھیلے جبے میں وہ کارٹون بنی رہتی تھی۔

شروع شروع میں بیچاری کی بہت بُری حالت ہوتی تھی۔ ہر وقت قے اور متلی قلفی والے کی آواز سنتی تو تڑپ جاتی اس کو بلاتی لیکن جب کھانے لگتی تو فوراً ہی جی ملش کرنے لگتا۔ سارے دن لیمو چوستی رہتی۔

ایک دن دوپہر کے وقت میں اس کے یہاں گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ بستر پر لیٹی ہے لیکن ٹانگیں اوپر اٹھا رکھی ہیں۔ میں نے مسکرا کر کہا "مسز ڈی سلوا ایکسر سائز کر رہی ہو کیا؟"

جھنجھلا کر بولی "ہم بہت تنگ آ گیا ہے۔ یوں ٹانگیں اوپر کرتا ہے تو ہمارا طبیعت کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے"

ٹھنڈی ٹھنڈی دیوار کے ساتھ پیر لگانے سے اُسے کچھ تسکین ہوتی تھی۔ بعض اوقات اُس کی طبیعت گھبراتی تھی تو زور زور سے میز کو یا بستر کو جہاں بھی وہ بیٹھی ہو۔ مکیاں مارنا شروع کر دیتی تھی۔ اور جب اس طرح گھبراہٹ کم نہیں ہوتی تھی تو تنگ آ کر رونا شروع کر دیتی تھی۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بہت ہنسی آتی تھی۔ چنانچہ وہ تمام تکلیفیں جو مجھ پر بیت چکی تھیں بھول کر اُس سے کہا کرتی تھی۔ "مسز ڈی سلوا جان بوجھ کر تم نے یہ مصیبت کیوں مول لی"

اس پر وہ بگڑ کر کہتی "وہ ہم نے کب لیا۔ پانچ برس کے پیچھے سالا یہ ہونے کو ہی مانگتا تھا"

میں کہتی "تو مسز ڈی سلوا پانچویں سال تم بنگلور کیوں نہ چلی گئیں"

وہ جواب دیتی "ہم چلا جاتا۔ سچ ہم جانے کو ایک دم تیار تھا پر یہ وار اسٹارٹ ہو گیا ہم وہاں رہتا ہمارا صاحب یہاں رہتا۔ ۔ ۔ ۔ خرچ بہت ہوتا سو یہ سوچ کر ہم نہ گیا اور سالا یہ آفت سر پر آن پڑا"

شروع شروع میں مسز ڈی سلوا کو یہ آفت معلوم ہوتی تھی پر اب وہ خوش

تھی کہ دوسرا بچہ پیدا ہونے والا ہے ۔ قے اور متلی ختم ہو گئی تھی ۔ ٹانگیں اوپر کر کے لیٹنے کی اب ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کی طبیعت ٹھیک رہتی تھی ۔ یہ سلسلہ صرف پہلے دو مہینے تک رہا تھا ۔

اب اسے کوئی تکلیف نہیں تھی ۔ ایک صرف کبھی کبھی پیٹ میں اینٹھن سی پیدا ہو جاتی تھی یا یہ ۔ بچہ جب پیٹ میں پھرتا تھا تو اُسے تھوڑے عرصے کے لئے بے چینی سی محسوس ہوتی تھی ۔

مسز ڈی سلوا بالکل تیار تھی ۔ چھوٹے چھوٹے فراک سی کر اُس نے ایک چھوٹے سے منے بیگ میں رکھ چھوڑے تھے ۔ نہالچے لوترڑے بھی تیار تھے ۔ اس کا خاوند لوہے کا ایک جھولا بھی لے آیا تھا ۔ اس کے لئے مسز ڈی سلوا نے پرانے تکیوں کے روئی سے ایک گدا بھی بنا لیا تھا ۔ غرض کہ سب سامان تیار تھا ۔ اب مسز ڈی سلوا کو صرف کسی ہسپتال میں جا کر بچہ جن دینا تھا اور بس ۔

مسٹر ڈی سلوا نے دو مہینے پہلے ہسپتال میں اپنی بیوی کے لئے جگہ بُک کر رکھی تھی پانچ روپے ایڈوانس دے دئے تھے تاکہ عین وقت پر گڑبڑ نہ ہو اور ہسپتال میں جگہ مل جائے ۔ مسٹر ڈی سلوا بہت دور اندیش تھا ۔ پہلے بچے کی پیدائش پر بھی اُس کے انتظامات ایسے ہی مکمل تھے ۔

مسز ڈی سلوا اپنے خاوند سے بھی کہیں زیادہ دور اندیش تھی جیسا کہ میں بتا چکی ہوں اُس نے اُن نو مہینوں کے اندر اندر وہ تمام سامان تیار کر لیا تھا جو بچے کے پہلے دو برسوں کے لئے ضروری ہوتا ہے ۔ نیچے بچھانے کے لئے ربڑ کے کپڑے فیڈر چسنیاں ۔ جھنجھنے اور دوسرے جاپانی کھلونے ، اسی

قسم کی اور چیزیں سب بڑی احتیاط سے اُس نے ایک علیحدہ ٹرنک میں تہہ کر رکھی تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ یہ ٹرنک کھول کر بیٹھ جاتی تھی اور ان چیزوں کو اور زیادہ قرینے سے رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ دراصل وہ دن گنتی تھی کہ جلدی بچہ پیدا ہو اور وہ اُسے گود میں لیکر کھلائے دُودھ پلائے۔ لوریاں دے اور جھولے میں لٹا کر سلائے پانچ برس کی تعطیل کے بعد اب گویا اس کا اسکول کھلنے والا تھا وہ اتنی ہی خوش تھی جتنا کہ طالب علم ایسے موقعوں پر ہوا کرتے ہیں۔

ہماری بلڈنگ کے سامنے ایک پارسی ڈاکٹر کا مطب تھا اس ڈاکٹر کے پاس مسز ڈی سلوا ہر روز نوکر کے ہاتھ اپنا قارورہ بھیجتی تھی۔ کہتے ہیں آخری دنوں میں قارورہ دیکھ کر ڈاکٹر بتا سکتے ہیں کہ بچہ کب پیدا ہوگا۔ مسز ڈی سلوا کا خیال تھا کہ دن پورے ہو گئے ہیں۔ مگر یہ ڈاکٹر کہتا تھا کہ نہیں ابھی کچھ دن باقی ہیں۔

ایک روز میں غسل خانے میں نہا رہی تھی کہ میں نے مسز ڈی سلوا کی گھبرائی ہوئی آواز سنی پھر دروازہ کھلا اور مسز ڈی سلوا کے کراہنے کی آواز آئی میں نے کھڑکی کھول کر دیکھا تو مسز ڈی سلوا اپنے خاوند کا سہارا لیکر اترنے والی تھی۔ رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا میری طرف دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ میں نے بڑی بوڑھی عورتوں کا انداز اختیار کر کے کہا "ساتھ خیر کے جاؤ اور ساتھ خیر کے واپس آؤ"

مسٹر ڈی سلوا نے جب میری آواز سنی تو مسکرا کر اپنے بھورے رنگ کا ہیٹ اتار کر مجھے سلام کیا۔ میں نے اس سے کہا "مسٹر ڈی سلوا جونہی بے بی ہو

مجھے ضرور خبر دیجئے گا۔

وہ مسکراہٹ جو مسز ڈی سلوا کے میلے ہونٹوں پر سلام کرتے وقت پیدا ہو چکی تھی۔ یہ سن کر اور پھیل گئی۔

سارا دن میرا دھیان مسز ڈی سلوا ہی میں پڑا رہا۔ کئی بار دروازہ کھول کر دیکھا مگر ہسپتال سے نہ تو نوکر ہی واپس آیا تھا۔ نہ مسز ڈی سلوا کا خاوند، شام ہو گئی۔ خدا جانے یہ لوگ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ مجھے کچھ دنوں کے لئے ماہم جانا تھا جہاں میری ایک بہن رہتی تھی۔ مجھے لینے کے لئے آدمی بھی آگیا مگر ہسپتال سے کوئی خبر نہ آئی۔

تیسرے روز ماہم سے جب میں واپس آئی تو اپنے گھر جانے کے بجائے میں نے مسز ڈی سلوا کے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا کیا دیکھتی ہوں کہ مسز ڈی سلوا میرے سامنے کھڑی ہے ——— جھکا سا پیٹ لئے میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا "یہ کیا ؟"

وہ مجھے اندر لے گئی اور کہنے لگی "ہم کو درد ہوا تو ہم سمجھا ٹائم پورا ہوا ہاں ہسپتال میں گیا اور جب نرس لوگ نے بیڈ پر لٹایا تو درد ایک دم غائب ہو گیا ... ہم بڑا حیران ہوا۔ نرس لوگ تو بڑا ہنسا بولا۔ اتنا جلدی تم یہاں کیوں آگیا ابھی کچھ دن گھر پر اور ٹھہرو۔ پیچھے آؤ ...... ہم کو بہت شرم آیا"

اس کا یہ بیان سن کر میں بہت ہنسی وہ بھی ہنسی۔ دیر تک ہم دونوں ہنستے رہے اس کے بعد اس نے مجھے سارا واقعہ تفصیل سے سنایا کہ کس طرح ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ ہسپتال گئی۔ وہاں ایک کمرے میں اس کے تمام کپڑے اتارے گئے۔ نام وغیرہ

درج کیا گیا اور ایک بستر پر لٹا کر اُسے نرسیں دوسرے کمرے میں چلی گئیں جہاں
سے کئی دفعہ اُسے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ اس بستر پر وہ چار پانچ گھنٹے تک
پڑی رہی اس دوران میں پہلے ایک نرس آئی اس نے اسے نہانے کو کہا۔ نہانے
سے فارغ ہوئی تو ایک نرس آئی اس نے اسے انیما دیا۔ انیما دینے کے بعد
تیسری نرس آئی جو اس کے انجکشن لگا گئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر آئی اس نے پیٹ
دیکھا تو جھنجھلا کر کہا "تم کیوں اتنی جلدی یہاں آگیا ہے۔ ابھی گھر جا کر آرام کرو"۔
سب نرسیں ہنسنے لگیں۔ وہ پانی پانی ہو گئی۔ کپڑے پہن کر باہر نکل آئی جہاں
اس کا خاوند کھڑا تھا۔

دونوں کو چونکہ ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اور مسز ڈی سلوا نے اس
دن کی چھٹی لے رکھی تھی۔ اس لئے وہ ریگل سینما میں میٹنی شو دیکھنے کے لئے چلے
گئے۔

مسز ڈی سلوا کو سخت حیرت تھی کہ یہ ہوا کیا۔ پچھلی دفعہ جب اس کے بچہ ہونے
والا تھا تو وہ عین موقع پر ہسپتال پہنچی تھی۔ اب اس کا اندازہ غلط کیوں نکلا۔ درد
ضرور ہوا تھا اور یہ بالکل ویسا ہی تھا جو اُسے پہلے بچے کی پیدائش سے تھوڑی
دیر پہلے ہوا تھا پھر یہ گڑبڑ کیوں ہو گئی؟

چھٹے روز شام کو ساڑھے آٹھ بجے کے قریب میں بالکنی میں بیٹھی تھی کہ مسٹر
ڈی سلوا کا نوکر آیا۔ دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھا کہنے لگا بیم صاحب
چھٹا مانگتا ہے۔ وہ ہسپتال جا رہی ہیں۔ میں نے جھٹ پٹ دس روپے کی ریزگاری
نکالی اور بھاگی بھاگی وہاں گئی۔ میاں بیوی دونوں تیار تھے۔ مسز ڈی سلوا کا

رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ درد کے مارے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ میں نے اور اس کے خاوند نے سہارا دے کر اُسے نیچے اُتارا اور ٹیکسی میں بٹھا دیا۔ "ساتھ خیر کے جاؤ اور ساتھ خیر کے واپس آؤ" کہہ کر میں اوپر گئی اور انتظار کرنے لگی۔

رات کے بارہ بجے تک میں سیڑھیوں کی طرف کان لگائے بیٹھی رہی مگر ہسپتال سے کوئی واپس نہ آیا۔ تھک ہار کر سو گئی۔ صبح اُٹھی تو دھوبی آگیا تو اس سے پندرہ دُھلائیوں کا حساب کرتے میں کچھ ایسی مشغول ہوئی کہ مسز ڈی سلوا کا دھیان ہی نہ رہا۔

دھوبی میلے کپڑوں کی گٹھڑی باندھ کر باہر نکلا۔ میں دروازے کے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس نے باہر نکل کر مسز ڈی سلوا کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کُھلا کیا دیکھتی ہوں کہ مسز ڈی سلوا کھڑی ہے۔ مٹکا سا پیٹ لئے۔

میں نے قریب قریب چیخ کر پوچھا: "مسز ڈی سلوا...... پھر واپس آگئیں" میں جب اس کے پاس گئی تو وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ شرم سے اس کا چہرہ گہرے سانولے رنگ کے باوجود سُرخ ہو رہا تھا۔ رُک رُک کر اُس نے مجھ سے کہا "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ درد بالکل پہلے کے موافق ہوتا ہے پر وہاں نرس لوگ کہتا ہے کہ جاؤ گھر جاؤ ابھی دیر ہے ...... یہ کیا ہو رہا ہے؟"

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بیچاری کی حالت

قابل رحم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مرتبہ نرسوں نے اُسے بہت بُری طرح جھڑکا تھا۔ حیرت شرم اور بوکھلاہٹ نے مل جل کر اس کو اس قدر قابل رحم بنا دیا تھا کہ مجھے اس کے ساتھ تھوڑے عرصہ کے لئے انتہائی ہمدردی ہو گئی۔ میں دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی۔ اس کو سمجھایا کہ اس میں شرم کی بات ہی کیا ہے۔ جب بچہ ہونے والا ہو تو ایسی غلط فہمیاں ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ نرسوں کا کام ہے بچے جنانا۔ اُن کے پاس آدمی اسی لئے جاتا ہے کہ آسانی سے یہ مرحلہ طے ہو جائے۔ انہیں مذاق اُڑانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اور جب فیس وغیرہ دی جائے گی۔ اور ایڈوانس دے دیا گیا ہے تو پھر وہ بے کار باتیں کیوں بناتی ہیں۔

مسز ڈی سلوا کی پریشانی کم نہ ہوئی۔ بات یہ تھی کہ اس کا خاوند دفتر سے دو دفعہ چھٹی لے چکا تھا۔ بڑے صاحب سے لے کر چپراسی تک سب کو معلوم تھا۔ کہ بچہ ہونے والا ہے۔ اب وہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اسی طرح محلّے میں سب کو معلوم تھا کہ مسز ڈی سلوا دو بار ہسپتال جا کر واپس آچکی ہے۔ کئی عورتیں اس کے پاس آچکی تھیں۔ اور ان سب کو فرداً فرداً اُسے بتانا پڑا تھا کہ بچہ ابھی تک پیدا کیوں نہیں ہوا۔ ہر ایک سے اُس نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ ایک نیک کرسچین عورت تھی۔ جھوٹ بولنے پر اُسے سخت روحانی تکلیف ہوتی تھی۔ مگر کیا کرتی مجبور تھی۔

ساتویں روز جب میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد پلنگ پر

لیٹ کر قریب قریب سو چکی تھی۔ دفعتاً میرے کانوں میں بچے کے رونے کی آواز آئی۔ یہ کیا؟ ...... دوڑ کر میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے فلیٹ سے مسز ڈی سلوا کا نوکر گھبرایا ہوا باہر نکل رہا تھا۔ اس کا رنگ فق تھا۔ کہنے لگا میم صاحب بے بی ...... میم صاحب بے بی ...... میں نے اندر جا کر دیکھا تو مسز ڈی سلوا نیم مدہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔ بے چاری نے اب مزید ندامت کے خوف سے وہیں بچہ جن دیا تھا۔

تحفہ

افراد

مجگل ..... (آواز میں بے نیازی ہو)	شیلا ..... (خوش آواز لڑکی)
گنیش (تعلیم یافتہ بنیا ۔ بولنے کا اچھا انداز)	ایک لڑکی --- شیلا کی سہیلی
دوکاندار (ان پڑھ بنیا۔ جھگڑالو قسم کا آدمی)	رامو ---- (نوکر)

(کالج کا گھنٹہ بجتا ہے ـــــ ساتھ ہی کئی قدموں کی آواز)

شیلا :- مجگل ـــــ مجگل !

مجگل :- اوہ ـــــ شیلا

شیلا :- میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں ۔

مجگل :- کہو ۔

شیلا :- میں نے بہت غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ہمارا آپس میں ملنا ٹھیک

نہیں۔ کالج میں یا کالج کے باہر اب ہمیں ایک دوسرے سے نہیں
ملنا چاہیئے۔

جگل :۔ کیوں ؟

شیلا :۔ اس لئے کہ ...

جگل :۔ کہو کہو ــــ صاف صاف کہو۔

شیلا :۔ اس لئے کہ لوگ تمہیں اول درجے کا بدمعاش۔ آوارہ گرد ــــ
اور لُچّا خیال کرتے ہیں۔

جگل :۔ (ہنستا ہے) صرف خیال ہی کرتے ہیں ...... انہیں اب تک
یقین ہونا چاہیئے تھا۔

شیلا :۔ جگل تم کبھی سنجیدہ ہونا بھی سیکھو گے یا نہیں۔

جگل :۔ نہیں۔

شیلا :۔ کیوں ؟

جگل :۔ سنجیدگی میں کیا دھرا ہے ...... یعنی خواہ مخواہ آدمی سنجیدہ ہوتا
پھرے۔ میں صحت مند ہوں اور صحت مند رہتا ہوں۔ اپنی زندگی
کو یہ روگ نہیں لگانا چاہتا۔

شیلا :۔ تم نے میرا فیصلہ سُن لیا۔

جگل :۔ سُن لیا۔

شیلا :۔ تمہیں قبول ہے ؟

جگل :۔ میں دوسروں کے فیصلے قبول نہیں کرتا ــــ میں تم سے ملوں گا

اور ملنسار ہوں گا۔

شیلا:۔ زندگی اجیرن کر دو گے میری ۔

جگل :۔ (مسکرا کر) میں تمہیں اپنی زندگی دے دوں گا۔

شیلا:۔ (ازراہِ مذاق) جو تمہارے اُس بوٹ کی طرح گھسی ہوئی ہے ۔

جگل :۔ استعمال جو زیادہ کرتا رہا ہوں مگر صرف اس کا تلا ہی گھسا ہے ۔ اوپر کا حصّہ بالکل ٹھیک ہے ___ پالش کر دو گی تو چمک اٹھے گا۔

شیلا:۔ تم خود پالش کیوں نہیں کرتے ؟

جگل :۔ اس لئے کہ ....

شیلا:۔ ٹھہرو ___ میں اس وقت سنجیدہ ہونا چاہتی ہوں ___ بتاؤ تم خود پالش کیوں نہیں کرتے ___ تم اپنی اصلاح کی کوشش کیوں نہیں کرتے لوگ تمہیں اول درجے کا آوارہ گرد سمجھتے ہیں ۔ تم ان کے دماغ سے یہ خیال دُور کیوں نہیں کرتے ___ تم کیوں اتنے بے پرواہ ہو ___ کیا تمہارا یہ لاابالی پن کبھی دور نہیں ہو گا ۔ کیا تم کبھی انسان نہیں بنو گے ؟

جگل :۔ آہستہ ، آہستہ ۔

شیلا:۔ لوگ میری جان کھا گئے ہیں ۔ جدھر جاتی ہوں میری طرف انگلیاں اٹھتی ہیں ___ میرے کیرکٹر پر حملے کئے جاتے ہیں ___ میں سب کچھ سہتی ہوں صرف تمہاری خاطر ۔

جگل :۔ میری خاطر ۔

شیلا:۔ بھگوان جانے میری عقل کو کیا ہو گیا ہے ۔ مجھے تم سے اتنا اُنس کیوں پیدا ہو گیا ہے — میں تم سے بالکل کنارہ کش ہو جاتی ۔ تمہارے خیال تک کو اپنے دل و دماغ سے محو کر دیتی مگر مجھے ترس آتا ہے کہ تم اور بھی زیادہ بہک جاؤ گے ۔

جگل :۔ تم مجھ پر ترس کھاتی ہو — میں کوئی زخمی گدھا نہیں ۔ کوئی لنگڑا کتا نہیں — کوئی بیمار بھینس نہیں ۔

شیلا :۔ (ذرا درشتی کے ساتھ) جگل ۔

جگل :۔ بکو نہیں ۔

شیلا :۔ (دھیمے لہجے میں، افسردگی کے ساتھ) جگل ۔

جگل :۔ جگل اول درجے کا بدمعاش ۔ شہدا ۔ لچا اور آوارہ گرد ہے ۔

شیلا :۔ میں نے یہ کبھی نہیں سمجھا ۔

جگل :۔ وہ اپنے بالوں میں تیل نہیں لگاتا ۔ میلے کپڑے پہنتا ہے ۔ اس کا جوتا پھٹا ہوا ہے ۔

شیلا :۔ میں نے یہ کبھی نہیں کہا ۔

جگل :۔ پہلے نہیں کہا تو اب کہہ لو — میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے نفرت کرو — ابھی اسی وقت — میں چاہتا ہوں کہ تمہاری عقل درست ہو جائے اور وہ رتی بھر اُنس جو تمہارے دل میں پیدا ہو گیا ہے دور ہو جائے تم مجھ سے بالکل کنارہ کش ہو جاؤ تاکہ میں اور زیادہ بہک سکوں ۔

شیلا :۔ تم کتنے بے رحم ہو ۔

جگل :- لوگ تمہاری جان کھا گئے ہیں جدھر جاتی ہو تمہاری طرف انگلیاں اٹھتی ہیں تمہارے کیرکٹر پر حملے کئے جاتے ہیں — صرف میری خاطر — مجھ شہدے لچے اور آوارہ گرد کی خاطر — تمہارا فیصلہ اب مجھے منظور ہے ۔اس لئے کہ تم مجھ پر بے کار ترس کھاتی رہی ہو — طبیعت پر جبر کر کے مجھ پر رحم کر تی رہی ہو۔

شیلا :- تم بہت جلد بھڑک اٹھے ہو۔ جگل ! مجھے تم سے جھوٹ موٹ کا انس نہیں ہے — میری ہمدردی مصنوعی ہمدردی نہیں ہے — میں تم پر ترس کھاتی ہوں اس لئے کہ دوسرے تم پر ترس نہیں کھاتے ۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم اور زیادہ بہک جاؤ۔ تمہارا وجود بالکل منتشر ہو جائے ۔ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں ۔ اس طور پر کہ تم پھر انہیں اکٹھا بھی نہ کر سکو — میں یہ نہیں چاہتی مجھے تم سے ہمدردی ہے میں عورت ہوں ۔ میں چاہتی ہوں کہ تم سلامت رہو ۔ وہ تمام خوبیاں جو لوگوں کے نزدیک ہیں تمہارے اندر پیدا ہو جائیں — میں بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکوں — جگل صاحب میرے دوست ہیں ۔

جگل :- (مسخر آمیز ہنسی) جگل صاحب — یہ جگل صاحب ہیں شہر کے بہت بڑے رئیس — بہت بڑا نام ہے آپ کا ۔ آپ کی پتلون میں چار پیوند لگے ہیں کوٹ آپ نے کسی دوست کا پہن رکھا ہے ۔ جوتا آپ کا پھٹا ہوا ہے ۔ (ہنستا ہے) یہ جگل صاحب ہیں (ہنستا ہے) جاؤ شیلا جاؤ ۔ ایک ناکارہ آدمی میں اتنی دلچسپی نہ لو — پڑھو ۔ امتحان پاس کرو اور

شادی کر کے اطمینان سے ایک جگہ بیٹھ جاؤ۔

(شادی کے ساتھ ہی شہنائیوں کا ریکارڈ لگا دیا جائے)
تھوڑی دیر کے بعد ہجوم کا شور پیدا کیا جائے۔ چند لمحات کے بعد ان
آوازوں کو دھیما کر دیا جائے اور ذیل کا مکالمہ سپر امپوز کیا جائے۔

ایک آدمی :۔ کیا ہو رہا ہے بھائی یہاں ؟
دوسرا آدمی :۔ شادی بیاہ ہو رہا ہے۔
جگل :۔ کس کا ؟
پہلا آدمی :۔ تم جانتے ہو ؟
جگل :۔ مجھے کیا معلوم۔
پہلا آدمی :۔ رائے بہادر شیام سندر جی کی سپتری شیلا کا بیاہ ہو رہا ہے۔
جگل :۔ کس کے ساتھ ؟
پہلا آدمی :۔ رائے صاحب لالہ گنیش پرشادی کے ساتھ۔ شہر کے بہت
بڑے رئیس ہیں۔ لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔
جگل :۔ ضرور کھیلتے ہوں گے۔ سگریٹ کا ایک کش مجھے بھی دینا۔
پہلا آدمی :۔ نیا لے لو۔
جگل :۔ نہیں نہیں۔ یہی دو۔ تم نیا سلگا لو (ہنستا ہے) سلگے سلگائے سگریٹ
مجھے اچھے لگتے ہیں اس لئے کہ سلگانے نہیں پڑتے۔

(شہنائیوں کی آواز بلند ہو کر پھر عقب میں چلی جائے)

مُجگل :- بڑا جگمھٹ لگا ہے۔

پہلا آدمی :- برات آ چکی ہے۔

مُجگل :- چلی بھی جائے گی۔

پہلا آدمی :- (ہنستا ہے) تو کیا یہیں بیٹھی رہے گی ــــ کیسی باتیں کرتے ہو یار۔

مُجگل :- (ہنستا ہے) بس ایسی باتیں ہی کیا کرتا ہوں۔

دوسرا آدمی :- یہ لڑکی کسے ڈھونڈ رہی ہے؟

مُجگل :- جانے بلا۔

پہلا آدمی :- تمہاری طرف دیکھ رہی ہے۔

مُجگل :- میری طرف۔۔۔۔؟ (ہنستا ہے) لیکن میں تو شادی نہیں کرنا چاہتا۔

(تینوں ہنستے ہیں)

لڑکی :- آپ میں سے کس کا نام مُجگل ہے؟

پہلا آدمی :- میرا تو نہیں ہے اِس سے پوچھ لو۔

لڑکی :- (مُجگل سے) کیا مُجگل صاحب آپ ہیں؟

مُجگل :- صاحب کوئی اور ہوگا۔ میں صرف مُجگل ہوں۔

لڑکی :- چلئے ــــ آپ کو اندر بلایا ہے۔

مُجگل :- کس نے؟

لڑکی :- آپ چلئے میں بتاتی ہوں۔

جگل:- کیا میرا چلنا ضروری ہے۔

لڑکی:- جی ہاں۔

جگل:- (اپنے ساتھیوں سے) اچھا بھئی رخصت چاہتا ہوں۔ سگریٹ کا شکریہ۔

پہلا آدمی:- (ازراہ مذاق) ایک اور لیتے جاؤ۔ شاید اندر ضرورت پڑے۔

جگل:- (ہنستا ہے) نہیں پڑے گی۔

(شہنائیوں اور ہجوم کا شور غضب سے ابھر آئے اور چند لمحات کے بعد دب جائے)

جگل:- آپ نے مجھے بلایا ——— فرمایئے؟

شیلا:- (اضطراب بھرے لہجے میں) تم نے مجھے آپ کیوں کہا؟

جگل:- دیر کے بعد ملاقات ہوئی اس لئے یہ اجنبیت پیدا ہو گئی۔

شیلا:- تم ابھی ویسے کے ویسے ہو۔

جگل:- جی ہاں ابھی تک ویسے کا ویسا ہوں۔ کیا جناب کو اس پر کوئی اعتراض ہے۔

شیلا:- (اور زیادہ مضطرب ہو کر) یہ آداب کس لئے؟

جگل:- آپ کے شاندار لباس سے مرعوب ہو گیا ہوں۔

شیلا:- (تنگ آکر) اُہ تم مجھے دیوانہ بنا دو گے۔ مجھے تم سے بہت کچھ کہنا

ہے۔ میں نے تمہیں یہاں اس لئے بلایا تھا کہ میں تم سے بے شمار باتیں کرنا چاہتی تھی مگر اب مجھے ایک بھی یاد نہیں آتی۔ تمہارے اس عجیب و غریب لہجے نے مجھے سب کچھ بھلا دیا ہے — بتاؤ مجھے کیا کہنا تھا؟

جگل:۔ مجھے کیا معلوم؟

شیلا:۔ تمہیں سب کچھ معلوم ہے۔ تم سب کچھ جانتے ہو — جلدی کرو۔ میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے۔ بتاؤ — بتاؤ۔ میں تم سے کیا کہنا چاہتی تھی — بتاتے کیوں نہیں؟

جگل:۔ مجھے کیا معلوم؟

شیلا:۔ تم — تم — تمہاری صحت کیسی ہے؟ — تم بہت دُبلے ہو گئے ہو — میں، میں بالکل اچھی ہوں۔ لیکن تم — (تنگ آکر) نہیں — میں کچھ اور ہی پوچھنا چاہتی تھی (باہر سے کسی عورت کی آواز آتی ہے۔ شیلا) — دیکھا — وقت ہو گیا — تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا — اور مجھے بے شمار باتیں کہنا تھیں۔

جگل:۔ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔

شیلا:۔ ہاں — ہاں — مجھے تم سے یہ بھی کہنا تھا۔

(دستک ہوتی ہے)

شیلا:۔ (دھیمی آواز میں) ٹھہرو . . . (جگل سے) کچھ اور بھی کہو۔

جگل:۔ کیا کہوں۔

(دستک ہوتی ہے)

شیلا:- اُئی — توبہ، دستک دے دیکر دروازہ توڑ دیا ہے (مجگل سے)
مجگل اب تم جاؤ۔ کیا کروں مجبوری ہے — لیکن دیکھو کبھی کبھی مجھ سے
ملنے کے لئے ضرور آیا کرنا — ضرور — ضرور — اِدھر سے ....

(دروازہ کھولنے کی آواز)

شیلا:- مجھے بھولنا مت — سنتے ہو۔ مجھے بھول نہ جانا۔

(شہنائیوں اور ہجوم کی آواز اُبھر کر اونچی ہو جاتی ہے۔ چند لمحات
کے بعد فیڈ آؤٹ۔

گنیش:- شیلا۔
شیلا:- جی۔
گنیش:- تمہارے البم میں یہ تصویر کس کی ہے۔
شیلا:- ٹھہریئے میں دیکھ کے بتاتی ہوں۔

(قدموں کی آواز)

شیلا:- یہ؟
گنیش:- کس کی ہے؟
شیلا:- مجگل صاحب کی۔
گنیش:- وہ کون۔
شیلا:- آپ نہیں جانتے — کالج میں یہ ہمارے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

گنیش :- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اس شخص کو کہیں دیکھا ہے۔
شیلا :- دیکھا ہوگا۔
گنیش :- ہوسکتا ہے مگر میں نے اسے اچھی طرح دیکھا تھا اس لئے کہ اس کا لباس اور اس کی وضع قطع ......

(گھڑی چار بجاتی ہے)

شیلا :- لیجئے چار بج گئے — اب کیا خاک تیاری ہو گی مجھ سے اور ہمیں ٹھیک پانچ بجے وہاں پہنچنا ہے — البم کو چھوڑیئے اور موٹر نکلوانے کے لئے کہئے۔
گنیش :- تمہیں ساڑھی تبدیل کرنا تھی۔
شیلا :- یہی ٹھیک ہے — ساڑھی تبدیل کروں گی تو ساری چیزیں بدلنا پڑیں گی۔ — نیا بلاؤز — نیا پیٹی کوٹ اور پھر یہ سینڈل بھی تو اُتارنا پڑے گی — یہی ٹھیک ہے۔
گنیش :- لیکن اتنی جلدی کیا ہے۔
شیلا :- واہ — مجھے راستے میں اپنی ایک دو سہیلیوں سے بھی تو ملنا ہے چلئے — چلئے۔

(قدموں کی چاپ۔ بعد میں موٹر کی آواز)

(ایک دم ہجوم کا شور سنائی دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ لڑجھگڑ رہے ہیں۔ شور کے اس ٹکڑے پر ذیل کا مکالمہ سُپر امپوز کیا جائے)

دکاندار:۔ نہیں صاحب اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ ایسے ہزاروں مجھے مجھے دے چکا ہے۔

ایک آدمی:۔ ایک بار اور دیکھ لو۔

دکاندار:۔ کیا دیکھ لوں ـــ اب کا گیا چھ مہینے اپنی شکل نہیں دکھائے گا۔ یہ تو اتفاق سے میری نظر پڑ گئی ورنہ کبھی ہاتھ نہ آتا۔

دوسرا آدمی:۔ تو اب تم کیا کرنا چاہتے ہو۔

دکاندار:۔ پکڑ کر تھانے میں لے جاؤں گا اور کیا کھڑا اس کا منہ دیکھتا رہوں گا۔

(موٹر کے ہارن کی آواز)

دکاندار:۔ آپ لوگ جائیے ـــ کیا کوئی تماشہ ہے۔

تیسرا آدمی:۔ تماشا ہی تو ہے تم اس سے اپنے روپے مانگتے ہو، یہ کہتا ہے میرے پاس نہیں۔ تم کہتے ہو۔ نہیں میں نہیں مانتا۔ تمہارے پاس ہوں نہ ہوں ابھی نکال کر دو۔

(بہت سے آدمی ہنستے ہیں)

دکاندار:۔ تو کیا کروں ـــ پھر بھاگ جائے گا ـــ کیا ساری عمر اسی کو ڈھونڈتا رہوں گا؟

پہلا آدمی:۔ ارے بھائی تم نے کیوں قرض لیا تھا۔ اب دیکھو کتنی خفت اٹھانی پڑ رہی ہے تمہیں۔

(موٹر کے ہارن کی آواز)

دوسرا آدمی :۔ بھئی راستہ سے تو ہٹ جاؤ۔

دکاندار :۔ آپ لوگ ہٹ جائیں۔ میں تو یہیں کھڑا رہوں گا۔ اس کا گریبان پکڑے۔

تیسرا آدمی :۔ یہ کیسا آدمی ہے خود کچھ بولتا ہی نہیں۔

دکاندار :۔ کیا بولے گا ـــــ روپیہ دینا ہے اور ہر حالت میں دینا ہے۔

(موٹر کے ہارن کی آواز۔ بالکل قریب)

گنیش :۔ راستے سے ہٹو گے یا موٹر اوپر چڑھا دوں ـــــ بازار کے عین بیچ میں تماشا لگا رکھا ہے!

(ہجوم کا شور)

شیلا :۔ (گھبرا کر) چلئے اب راستہ صاف ہو گیا۔

گنیش :۔ ٹھہرو۔۔۔۔ (بلند آواز میں) اے ـــــ ذرا ادھر آؤ۔

دکاندار :۔ مجھے بلایا ہے سیٹھ صاحب؟

گنیش :۔ کیا بات ہے؟

دکاندار :۔ روپیہ لینا ہے سیٹھ صاحب، چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ برابر مجھے گھسے دیئے چلا جا رہا ہے۔ آج دیتا ہوں۔ کل دیتا ہوں۔ بس اس طرح چھ مہینے گزر گئے ہیں۔

گنیش :۔ کتنی رقم نکلتی ہے تمہاری اس کی طرف۔

دکاندار :۔ سوا نو روپے۔

گنیش :۔ بس۔۔۔۔ (قہقہہ) لو یہ دس روپیہ کا نوٹ۔

شیلا:۔ (اضطراب کے لہجے میں) آپ کیوں کسی کا قرض ادا کرتے ہیں ــــ وہ خود ادا کرے۔

گنیش:۔ کہاں سے ادا کریگا... (دکاندار سے) سوا نو روپے کہے تھے نا تم نے۔

دکاندار:۔ جی ہاں۔

گنیش:۔ بارہ آنے بچیں گے۔ یہ تم اُسے دے دینا۔

شیلا:۔ (قریب قریب چیخ کر) آپ نوٹ واپس لیجئے ــــ آپ زبردستی بھیک دے رہے ہیں....

(موٹر اسٹارٹ ہوتی ہے اور چل پڑتی ہے)

پہلا آدمی:۔ یہ کون تھے؟

جگل:۔ (زہرخند کے ساتھ) تم نہیں جانتے یہ کون تھے ــــ یہ شہر کے بہت بڑے رئیس تھے۔ رائے صاحب لالہ گنیش پرشاد ــــ لاکھوں میں کھیلتے ہیں ــــ تم نے دیکھا نہیں تھا کہ ان کی پتلون میں ایک بھی پیوند نہیں تھا۔ کوٹ ان کا اپنا تھا۔ جوتا بالکل نیا تھا......

دکاندار:۔ لو یہ بارہ آنے۔

جگل:۔ لاؤ ــــ میری جیب بالکل خالی تھی۔

(ہجوم کا شور ــــ چند لمحات کے بعد فیڈ آپ)

آہستہ آہستہ ذیل کی غزل کی دُھن شروع ہو ــــ سازوں پر پھر شعر گائے جائیں۔

غزل

غم کی دنیا بسا رہی ہوں میں
اُن کو اپنا بنا رہی ہوں میں
سازِ ہستی کے تار ٹوٹ نہ جائیں
نغمۂ دل سنا رہی ہوں میں
سعیِ ناکام کے چراغوں کو
آندھیوں میں جلا رہی ہوں میں (پروین)

(چند لمحات تک ساز دردناک لے میں بجتے رہیں)

گنیش :۔ شیلا۔
شیلا :۔ (افسردگی کے ساتھ) جی!
گنیش :۔ تمہارے البم سے وہ تصویر کہاں گئی۔
شیلا :۔ وہ جو آپ نے اس روز دیکھی تھی۔
گنیش :۔ ہاں وہی۔
شیلا :۔ نکال دی ہے۔
گنیش :۔ کیوں ..... بڑی اچھی تصویر تھی۔
شیلا :۔ (لہجے میں دبے ہوئے صدمے کے آثار نظر آتے ہیں) اچھی ہی تھی۔
گنیش :۔ تو نکال کیوں پھینکی ؟
شیلا :۔ نکالی ہے، پھینکی نہیں !
گنیش :۔ میرا مطلب یہی تھا۔

شیلا:۔ اچھا۔

گنیش:۔ تمہاری طبیعت کئی دنوں سے سست سی ہے ۔۔۔۔ غالباً اُسی دن سے جب ہم موٹر میں باہر گئے تھے۔

شیلا:۔ جی ہاں۔ اُسی دن سے سست ہے ہوا لگ گئی تھی۔

گنیش:۔ مجھے یاد آیا۔ اُس روز واقعی ہوا بہت تیز تھی۔

شیلا:۔ سرد بھی۔

گنیش:۔ سرد بھی ۔۔۔۔ یہ ہوا بعض اوقات بہت تیز اور سرد ہو جاتی ہے۔

شیلا:۔ جی ہاں۔

گنیش:۔ شیلا اپنے اس دوست کی کچھ باتیں تو سناؤ۔ تمہاری طبیعت بہل جائیگی۔

شیلا:۔ کیا سناؤں؟

گنیش:۔ کچھ بھی ۔۔۔ تصویر سے آدمی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ کیا نام بتایا تھا۔

شیلا:۔ مجگل صاحب۔

گنیش:۔ مجگل صاحب (صاحب پر زور دیکر) آپ کی کوئی خاص خوبی۔

شیلا:۔ آوارہ مزاجی۔

گنیش:۔ (ہنستا ہے) مذاق کرتی ہو۔

شیلا:۔ (انتہائی سنجیدگی کے ساتھ) مذاق نہیں کرتی مجگل صاحب کی سب سے بڑی خوبی اُن کی آوارہ مزاجی ہے۔ اُن کا لاابالی پن!

گنیش:۔ تو وہ ایک نہیں کئی خوبیوں کے مالک ہیں۔

شیلا:۔ جی ہاں ۔۔۔ وہ بیحد مفلس ۔۔۔ انتہا درجے کے غلاظت پسند۔ بدتمیز

ادب آداب سے ناواقف (آواز گلوگیر ہو جاتی ہے) بدزبان
اور ذلت پسند ہیں۔

گنیش:۔ تم صریحاً مذاق کر رہی ہو۔ میں ہرگز ماننے کے لئے تیار نہیں۔

شیلا:۔ (تلخ لہجے میں) مذاق آپ کر رہے ہیں۔

گنیش:۔ تمہاری سالگرہ کی خوشی میں آج شام کو ایک دعوت کر رہا ہوں تم جگل
صاحب کو بلا لو میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔

شیلا:۔ (ایک دم بھڑک اٹھتی ہے) بس۔ بس ــ اب آپ میری آتما کو دکھ نہ
دیجئے۔ بہت زہریلی سوئیاں آپ مجھے چبھو چکے .... (روتی آواز میں) جی
بھر کے آپ نے مجھے ذلیل کر لیا۔ کیا ابھی تک کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا......
جو کچھ آپ چاہتے تھے میں نے کہہ دیا ہے ــ آپ نے کہلوا لیا ہے ــ
اب آپ اور کیا چاہتے ہیں۔ وہ بدمعاش ہے۔ لچا ہے۔ آوارہ گرد ہے ــ
انسانیت کے دامن پر بدنما دھبہ ہے ــ قابلِ نفرت انسان ہے ــ
کچھ اور کہوں یا اتنا ہی کافی ہے۔

گنیش:۔ (جچے تلے انداز میں) اتنا کافی نہیں ہے۔ آج شام کو وہ دعوت میں
ضرور شریک ہوں گے۔

شیلا:۔ میں اسے ہرگز نہیں بلاؤں گی۔

گنیش:۔ مجھے معلوم تھا اس لئے میں نے خود اُن سے آنے کو کہا اور انہوں نے
کمال عنایت سے میری درخواست قبول کر لی۔

شیلا:۔ (سخت گھبراہٹ کے ساتھ) وہ آئیگا۔ نہیں نہیں ــ وہ کبھی نہیں

آئے گا ــــ اگر وہ آئے گا تو آپ مجھے موجود نہ پائے گا ۔

گنیش :۔ میں اس کا انتظام بھی کر لوں گا (ہنستا ہے) ۔۔۔ آج شام کو پانچ بجے تم دونوں دعوت میں شریک ہو گے ۔

(گھڑیال کے الارم کی خرخراہٹ۔ پانچ بجنے کی آواز اور ساتھ ہی ہجوم کا شور)

ایک مہمان :۔ رائے صاحب بڑے ٹھاٹ کی دعوت کی ہے ۔

گنیش :۔ لالہ جی شیلا کی سالگرہ ہو اور یہ ٹھاٹ نہ کئے جائیں (مسکرا کر) کیوں شیلا ؟

شیلا :۔ اتنا اہتمام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں ۔

گنیش :۔ (مسکرا کر) صرف تمہاری خاطر ۔

دوسرا مہمان :۔ رائے صاحب ــــ اب کس کا انتظار ہے دعوت شروع ہو ۔

گنیش :۔ سب مہمان آچکے ہیں سوائے ایک کے ، ان کے بغیر پروگرام شروع نہیں ہو سکتا ۔

دوسرا مہمان :۔ کون ہیں یہ مہاشے ؟

گنیش :۔ شیلا کے کالج کے زمانے کے دوست ــــ جگل صاحب ابھی تک آئے نہیں شیلا ؟

شیلا :۔ آ ہی جائیں گے ۔

(موٹر کے ہارن کی آواز)

تیسرا مہمان :- یہ کون آیا ؟

دوسرا مہمان :- آگے بڑھ کے دیکھ لو۔

(قدموں کی آواز)

تیسرا مہمان :- بڑی شان دار موٹر ہے۔

چوتھا مہمان :- بالکل نیا ماڈل ہے۔

تیسرا مہمان :- آج کل تو بہت زیادہ قیمت ہوگی اس کی

(قدموں کی آواز)

رامو :- سرکار، جگل صاحب تشریف لائے ہیں۔

گنیش :- آگئے ؟

رامو :- ہاں سرکار آگئے۔

گنیش :- انہیں اندر لے آؤ ــــ رامو۔

(قدموں کی آواز، مائکروفون کی طرف)

گنیش :- (حیرت کے ساتھ) یہ کون ہے ؟

(قدموں کی آواز قریب تر آجاتی ہے)

جگل :- (باوقار، شگفتہ اور بائمیز لہجے میں) اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ میں سے کون صاحب خانہ ہیں۔

شیلا :- جگل . . . تم . . . تم . . . ؟

جگل :- اوہ . . . شیلا . . . بھئی پہلے مجھے اپنے پتی سے متعارف

کراؤ۔ جنہوں نے مجھے یہاں مدعو کیا۔

گنیش :۔ ...... میں حاضر ہوں۔

مجگل :۔ پہلے آپ میرا شکریہ قبول کیجئے کہ آپ نے مجھے اس شاندار دعوت میں شریک کیا۔ آپ نے جو آدمی میرے پاس بھیجا تھا میں نے اُس سے کہہ دیا تھا کہ بے حد مصروف ہونے کے باوجود میں ضرور آؤں گا۔ شیلا تمہارے رائے صاحب بڑے ہی اچھے آدمی ہیں۔ تم بہت خوش نصیب ہو ۔۔۔ کیوں جناب میں غلط کہہ رہا ہوں ؟

گنیش :۔ (چونک کر) کیا کہا آپ نے ۔

مجگل :۔ (ہنستا ہے) اچھا ہو گئی ہے ۔۔۔ شیلا مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے ۔۔۔ دراصل جائداد کے انتظام اور دوسرے کاموں میں اس قدر مشغول ہوا کہ سب کچھ بھول گیا (ہنستا ہے) دولت کمانا اور اس کو سنبھالنا بہت بڑی دردسری ہے ۔۔۔ تمہاری صحت تو اب اچھی ہے ۔

شیلا :۔ (خاموش رہتی ہے)

مجگل :۔ رائے صاحب ۔ یہ آپ نے شیلا کو کیا کر دیا ہے ۔ کچھ بولتی ہی نہیں ۔۔۔ بالکل گونگی ہو گئی ہے ۔۔۔ اور آپ .....

گنیش :۔ میں ۔۔۔ میں ..... !

مجگل :۔ جی ہاں آپ کیا سوچ رہے ہیں ۔۔۔ ذرا ہنگامہ شروع کیا ہو ۔۔۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے جو پروگرام آپ نے بنایا ہے بس اب

شروع ہو جائے ۔۔۔ ہاں بھئی شیلا ۔۔۔ میں تمہارے لئے ایک تحفہ لایا ہوں۔

شیلا:۔ (مردہ آواز میں) تحفہ؟

گجگل:۔ میرا خیال ہے کہ میں تمہارے لئے ایک تحفہ لایا ہوں ۔۔۔ رائے صاحب آپ پروگرام شروع نہیں کرتے ۔۔۔ اب دیر کیا ہے۔

(مکمل خاموشی)

گجگل:۔ یہ خاموشی کیوں؟

(وقفہ)

گجگل:۔ آپ نہیں شروع کرتے تو لیجئے۔ میں شروع کرتا ہوں (بلند آواز میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے) حضرات سنئے!

(ہجوم کی سرگوشیاں)

گجگل:۔ (تقریر کے انداز میں) رائے صاحب لالہ گنیش پرشاد جی نے آپ کو ایک بندر کا تماشا دکھانے کا انتظام کیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ بندر نہیں آیا ۔۔۔ اس کے بدلے میں آ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(ہجوم کی سرگوشیاں)

گجگل:۔ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ میں بندر نہیں ہوں خوش پوش انسان ہوں آپ نے میرا لباس یقیناً پسند کیا ہوگا۔ وہ موٹر کار بھی پسند کی ہوگی جو ابھی تک باہر کھڑی ہے ۔۔۔ میری گفتگو بھی آپ کو ضرور بھاتی ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ یہ میری سونے کی گھڑی ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ہیرے کی انگوٹھی بہت قیمتی ہے ۔۔۔ لیکن آپ کی نگاہوں نے تو میری ہر چیز کو تول لیا ہوگا اور اس کی

قیمت بھی مقرر کر لی ہو گی (لہجے میں طنز پیدا ہو جاتا ہے) آپ سب شریف آدمی ہیں..... میں بھی شریف آدمی ہوں - اس لئے کہ میرا لباس اچھا ہے - میری موٹر اچھی ہے، میری انگوٹھی اچھی ہے -

گنیش :- مسٹر جھگل -

جھگل :- خاموش رائے صاحب خاموش - جب ایک شریف آدمی بات کر رہا ہو تو اُسے بیچ میں نہیں ٹوکنا چاہیئے ____ یہ گنوار پن ہے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں اور میرے پاس وقت بہت تھوڑا ہے مجھے ایک بہت ضروری کام پر جانا ہے میں آوارہ گرد - لچا - بدمعاش اور ذلیل انسان نہیں ہوں اس لئے کہ میں مفلس نہیں - میرے پاس بے شمار دولت ہے (ہنستا ہے) بیشمار دولت، اتنی کہ مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھلتی ___ دولت بڑی اچھی چیز ہے - یہ نہ ہو تو آپ کیا ہیں........ محض بندر -

(ہجوم کا شور)

جھگل :- خاموش..... اگر دولت نہ ہوتی تو آپ سب بندر ہوتے - لوگ ڈگڈگیاں بجا کر آپ کو نچاتے ___ آپ کے دماغوں میں بھس بھرا ہے لیکن آپ عقل مند ہیں - صرف دولت کی وجہ سے ___ آپ بدشکل ہیں - آپ کی توندیں ابھری ہوئی ہیں لیکن آپ خوبصورت ہیں - خوبصورت بیویوں کے شوہر ہیں - اس لئے کہ آپ دولت مند ہیں ___ آپ بھری محفل میں ڈکاریں لیں - میز پر ننگی ٹانگیں رکھ کر بیٹھ جائیں - جمائیوں پر جمائیاں لیں لیکن آپ کو کوئی بدتمیز نہیں کہے گا ___ آپ بڈھے ہو کر جوان ہو سکتے ہیں - لیکن جب

کے پاس دولت نہیں وہ جوانی میں بھی جوان نہیں ہو سکتے — دولت عجیب و غریب چیز ہے۔

آپ اپنی منحوس اور بھیانک شکل کی تعریف میں شاعروں سے قصیدے لکھوا سکتے ہیں — بڑے بڑے آرٹسٹوں سے اپنی تصویر کھچوا سکتے ہیں۔ خوبصورت عورتوں سے رومان لڑا سکتے ہیں — دولت عجیب و غریب چیز ہے (ہنستا ہے) دولت عجیب و غریب چیز ہے — (ہنستا ہے) میں بھی دولت مند ہوں — بڑا دولتمند (دیوانہ وار ہنستا ہے — ہنستے ہنستے آخر میں آواز بالکل کمزور سمردہ ہو جاتی ہے) بہت بڑا دولت مند۔

شیلا :۔ (ایک دم چیخ کر) جگل .... جگل۔

(جگل کے گرنے کی آواز۔ ہجوم کا شور)

شیلا :۔ (بھاگ کر جگل کے پاس جاتی ہے) جگل — جگل — یہ کیا ہو گیا تمہیں — گر کیوں پڑے — سنتے ہو؟

جگل :۔ (کمزور آواز میں کمزور ہنسی کے ساتھ) میں بہت بڑا دولت مند ہوں بہت بڑا — آٹھ روز سے میں نے کچھ نہیں کھایا اور دو مہینے سے بیمار ہوں — رائے صاحب، آٹھ روز سے میں نے کچھ نہیں کھایا۔ کہاں ہیں رائے صاحب۔

شیلا :۔ (گلوگیر آواز میں) جگل ....

جگل :۔ شیلا۔ جگل نہیں۔ جگل صاحب کہو — ان لوگوں سے فخر کے ساتھ کہو

مگجل صاحب ہیں ۔۔۔ میرے دوست ۔۔۔ ان کی پتلون اپنی نہیں ۔۔۔
کوٹ قمیص ۔ ٹائی ۔ جوتا ۔ انگوٹھی ۔ گھڑی ۔۔۔ ان میں سے کوئی چیز بھی
اُن کی نہیں ۔۔۔ یہ سب چیزیں پیاس کی ہیں جو نیچے اپنی موٹر میں میرا
لباس پہنے بندھا پڑا ہے ۔ جانے کون گدھا ہے ۔۔۔ لیکن ہے
دولت مند (ہنستا ہے)

شیلا :۔ تم نے کیا کیا مگجل ؟

مگجل :۔ (مسکرا کر) ایک تماشے کے بدلے دوسرا تماشا ۔۔۔ کیا میں اس لباس
میں شریف اور مہذب انسان دکھائی نہیں دیتا ۔۔۔ کیا ہوا جو مجھے آٹھ
روز سے کھانے کو نہیں ملا ۔۔۔ کیا ہوا اگر ضعف کے باعث میری زندگی
ختم ہو رہی ہے ۔۔۔ کیا ہوا ۔ ایک آوارہ گرد کم ہو جائے گا ۔۔۔
ایک ناکارہ انسان یہاں سے دفع ہو جائے گا ۔۔۔ اچھا شیلا
میں اب جاتا ہوں ۔۔۔

شیلا :۔ کہاں ۔

مگجل :۔ موت نے بلا بھیجا ہے ۔۔۔ وہاں بھی شاید ایسی دعوت ہو گی ۔

شیلا :۔ (گلوگیر آواز میں) میرا تحفہ ۔

مگجل :۔ تمہارا تحفہ ۔۔۔ ہاں تمہارا تحفہ ۔۔۔ میرا سب کچھ تو نیچے موٹر میں
پڑا ہے ۔

(وقفہ تمہارے اس نوکر کا کیا نام ہے)

شیلا :۔ رامو ۔

جگل :۔ رامو۔ ذرا آگے آؤ ــــ آجاؤ۔ ڈرو نہیں۔

(وقفہ)

جگل :۔ اس کی آنکھوں میں تمہیں وہ میلے آنسو نظر آ رہے ہیں؟

شیلا :۔ آ رہے ہیں۔

جگل :۔ یہی آنسو میرا تحفہ ہیں جو یہاں اور کسی کی آنکھوں میں نظر نہیں آتے میں نے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی چیز تمہیں دے دی ہے ــــ رامو بیڑی ہے تمہارے پاس؟

رامو :۔ ہے سرکار۔

جگل :۔ ایک سلگا کر مجھے دو۔

(ماچس کی کھڑکھڑاہٹ)

جگل :۔ (بالکل دھیمے لہجے میں) آوارہ گرد ــــ لچا ــــ بدمعاش ــــ (آواز بالکل ڈوب جاتی ہے)

رامو :۔ لیجئے سرکار بیڑی۔

جگل :۔ (سرگوشی میں ــــ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ) سرکار......

شیلا :۔ (ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتی ہے) جگل... جگل....

(سسکیاں ــــ فیڈ آؤٹ)

غسل خانہ

صدر دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی سیڑھیوں کے پاس ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے جس میں کبھی اُپلے اور لکڑیاں کوئلے رکھے جاتے تھے۔ مگر اب اس میں نل لگاکر اسی کو مردانہ غسل خانے میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ فرش وغیرہ مضبوط بنا دیا گیا ہے تاکہ مکان کی بنیادوں میں پانی نہ چلا جائے۔ اس میں صرف ایک کھڑکی ہے جو گلی کی طرف کھلتی ہے اس میں زنگ آلود سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔

میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا جب یہ غسل خانہ میری زندگی میں داخل ہوا آپ کو حیرت ہوگی کہ غسل خانے انسانوں کی زندگی میں کیونکر داخل ہو سکتے ہیں۔ غسل خانہ تو ایسی چیز ہے جس میں آدمی داخل ہوتا ہے اور دیر تک داخل رہتا ہے۔ لیکن جب آپ میری کہانی سن لیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ

یہ غسل خانہ واقعی میری زندگی میں داخل ہوا اور اس کا ایک اہم ترین جزو بن کے رہ گیا۔

یوں تو میں اس غسل خانے سے اس وقت کا متعارف ہوں جب اس میں اُپلے وغیرہ پڑے رہتے تھے اور میری بلّی نے اس میں بھیگے ہوئے چوہوں کی شکل کے چار بچے دیئے تھے۔ ان کی آنکھیں دس بارہ روز تک مُندی رہی تھیں چنانچہ جب میرا چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا۔ تو اس کی آنکھیں کُھلی دیکھ کر میں نے امّی جان سے کہا تھا "امّی جان میری بلّی ٹیڈی نے جب بچے دیئے تھے تو ان کی آنکھیں بند تھیں اس کی کیوں کھلی ہوئی ہیں"

یعنی میں بچپن ہی سے اس غسل خانے کو جانتا ہوں لیکن یہ میری زندگی میں اس وقت داخل ہوا۔ جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ایک بھاری بھرکم بستہ بغل میں دبا کر ہر روز اسکول جایا کرتا تھا۔

ایک روز کا ذکر ہے میں نے اسکول سے گھر آتے ہوئے سردار دو ہا وانگھ پھل فروش کی دوکان سے ایک کابلی انار چرالیا۔ میں اور میرے دو ہم جماعت لڑکے ہر روز کچھ نہ کچھ اس دوکان سے چرایا کرتے تھے۔ لیکن بھائی دو ہا دا انگھ جو پھلوں کے ٹوکروں میں گھرا ایک بڑی سی پگڑی اپنے کیسوں پر رکھے سارا دن افیم کے نشے میں اونگھتا رہتا تھا خبر تک نہ ہوتی تھی۔ مگر بات یہ ہے کہ ہم بڑی بڑی چیزیں نہیں چراتے تھے۔ کبھی انگور کے چند دانے اٹھالئے کبھی لوکاٹ کا ایک گچھا نے اُڑے۔ کبھی مٹھی بھر خوبانیاں اٹھائیں اور چلتے بنے۔ لیکن اس دفعہ چونکہ میں نے زیادتی کی تھی اس لئے پکڑا گیا۔

ایک دم بھائی دوہا واسنگھ اپنی ابدی نیند سے چونکا اور اپنی چھپرتی سے نیچے اُتر کر اس نے مجھے رنگے ہاتھوں سے پکڑا کہ میں دنگ رہ گیا۔ ساتھ ہی میرے حواس باختہ ہوگئے۔ پہلے تو میں اس چوری کو کھیل سمجھا تھا لیکن جب میلی ڈاڑھی والے سردار دوہا واسنگھ نے اپنی پھولی ہوئی رگوں والے ہاتھ سے میری گردن ناپی تو مجھے احساس ہوا کہ میں چور ہوں۔

بچپن ہی سے مجھے اس بات کا خیال رہا ہے کہ لوگوں کے سامنے میری ذلت نہ ہو۔ چنانچہ سرِ بازار جب میں نے خود کو ذلیل ہوتے دیکھا تو فوراً بھائی دوہا واسنگھ سے معافی مانگ لی۔ آدمی کا دل بہت اچھا تھا۔ انار میرے ہاتھ سے چھین کر اس نے وہ میل جو اس کے خیال کے مطابق انار کو لگ گیا تھا۔ اپنے کرتے سے صاف کیا اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا "وکیل صاحب آئے تو میں ان سے کہوں گا کہ آپ کے لڑکے نے اب چوری شروع کر دی ہے۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں تو سمجھا کہ سستے چھوٹ گئے۔ وکیل صاحب یعنی میرے اباجی سردار دوہا واسنگھ نہیں تھے۔ وہ نہ افیم کا نشہ کرتے تھے اور نہ انہیں پھلوں ہی سے کوئی دلچسپی تھی۔ میں نے سوچا اگر اس کمبخت دوہا واسنگھ نے ان سے میری چوری کا ذکر کر دیا تو وہ گھر میں داخل ہوتے ہی امی جان سے کہیں گے۔ "کچھ سنتی ہو۔ اب تمہارے اس برخوردار نے چوری چکاری بھی شروع کر دی ہے۔ سردار دوہا واسنگھ نے جب مجھ سے کہا کہ وکیل صاحب آپ کا لڑکا انار اٹھا کے بھاگ گیا

تھا تو خدا کی قسم میں شرم سے پانی پانی ہو گیا ـــــ میں نے آج تک اپنی ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دی۔ لیکن اس نالائق نے میری ساری عزت خاک میں ملا دی ہے۔"

وہ مجھے دو تین طمانچے مار کر مطمئن ہو جاتے مگر امی جان کا ناک میں دم کر دیتے۔ اس لئے کہ وہ ہماری طرف داری کرتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ ان کی اولاد (ہم چھ بیٹے تھے) سے کوئی چھوٹی سی لغزش ہو اور وہ آنگن میں اپنے گنجے سر کا پسینہ پونچھ پونچھ کر امی جان کو کوسنا شروع کر دیں جیسے سارا قصور ان کا ہے۔

کوسنے کے بعد بھی ان کا جی ہلکا نہیں ہوتا تھا۔ اس روز کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اور دیر تک خاموش آنگن میں ـــــ سیمنٹ لگے فرش پر ادھر ادھر ٹہلتے رہتے تھے۔

جس وقت بھائی دو ہاوا سنگھ نے وکیل صاحب کا نام لیا۔ میری آنکھوں کے سامنے ابا جی کا گنجا سر آگیا جس پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں ان کو ہمیشہ غصے کے وقت اس جگہ پر پسینہ آتا ہے۔

بستہ میری بغل میں بہت وزنی ہو گیا۔ ٹانگیں بے جان سی ہو گئیں۔ دل دھڑکنے لگا۔ شرم کا وہ احساس جو چوری پکڑے جانے پر پیدا ہوا مٹ گیا اور اس کی جگہ ایک تکلیف دہ خوف نے لے لی۔ ابا جی کا گنجا سر۔ اس پر چمکتی ہوئی پسینے کی ننھی ننھی بوندیں۔ آنگن کا سیمنٹ لگا فرش۔ اس پر ان کا غصے میں اِدھر اُدھر چکر لگاتے ہوئے ببر شیر کی طرح چلنا اور رک رک

کرامی جان پر برسنا۔۔۔۔۔۔۔

سخت پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا غسل خانے کے پاس ٹھہر کر میں نے ایک بار سوچا کہ اگر اس کمبخت پھل فروش نے سچ مچ اباجی سے کہہ دیا تو آفت ہی آجائے گی اور تین روز کے لئے سارا گھر جہنم کا نمونہ بن جائے گا۔ اباجی اور سب کچھ معاف کر سکتے تھے۔ لیکن چوری کبھی معاف نہیں کرتے تھے۔ ہمارے پرانے ملازم نبو نے ایک بار دس روپے کا نوٹ امی جان کے پان دان سے نکال لیا تھا ــــ امی جان نے تو اُسے معاف کر دیا تھا۔ لیکن اباجی کو جب اس چوری کا پتا چلا تو انہوں نے اُسے نکال باہر کیا۔ "میں اپنے گھر میں کسی چور کو نہیں رکھ سکتا"

اُن کے یہ الفاظ میرے کانوں میں کئی بار گونج چکے تھے۔ میں نے اوپر جانے کے لئے زینے پر قدم ہی رکھا کہ اُن کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ جانے وہ میرے بڑے بھائی ثقلین سے کیا کہہ رہے تھے۔ لیکن میں یہی سمجھا کہ وہ نبو کو گھر سے باہر نکال رہے ہیں اور اس سے غصے میں یہ کہہ رہے ہیں "میں اپنے گھر میں کسی چور کو نہیں رکھ سکتا"

میرے قدم منوں بھاری ہو گئے۔ میں اور زیادہ سہم گیا اور اوپر جانے کے بجائے نیچے اُتر آیا۔ خدا معلوم کیا جی میں آئی کہ غسل خانے کے اندر جا کر میں نے صدق دل سے دعا مانگی کہ اباجی کو میری چوری کا علم نہ ہو۔ یعنی دوہاواسنگھ اُن سے اس بات کا ذکر کرنا بھول جائے۔ دعا مانگنے کے بعد میرے جی کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔ چنانچہ میں اوپر چلا گیا۔

خدا نے میری دعا قبول کی۔ دریا وا سنگھ اور اس کی دکان ابھی تک موجود ہے۔ لیکن اس نے اباجی سے انار کی چوری کا ذکر نہیں کیا ــــ غسل خانہ یہیں سے میری زندگی میں داخل ہوتا ہے۔

ایک بار پھر ایسی ہی بات ہوئی۔ میں زیادہ لطف لینے کی خاطر پہلی دفعہ بازار میں کھلے بندوں سگریٹ پیتے جا رہا تھا کہ اباجی کے ایک دوست سے میری مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس نے سگریٹ میرے ہاتھ سے چھین کر غصے میں ایک طرف پھینک دیا اور کہا۔ "تم بہت آوارہ ہو گئے ہو۔ بڑوں کا شرم و لحاظ اب تمہاری آنکھوں میں بالکل نہیں رہا۔ خواجہ صاحب سے کہہ کر آج ہی تمہاری اچھی طرح گوشمالی کراؤں گا"

انار کی چوری کے مقابلے میں کھلے بندوں سگریٹ پینا اور بھی زیادہ خطرناک تھا۔ خواجہ صاحب یعنی میرے اباجی خود سگریٹ پیتے تھے۔ مگر اپنی اولاد کے لئے انہوں نے اس چیز کو قطعی طور پر ممنوع قرار دے رکھا تھا ایک روز میرے بڑے بھائی کی جیب میں سے انہیں سگریٹ کی ڈبیا مل گئی تھی جس پر انہوں نے ایک تھپڑ لگا کر فیصلہ کن لہجے میں یہ الفاظ کہے تھے۔ "ثقلین اگر میں نے تمہاری جیب میں پھر سگریٹ کی ڈبیا دیکھی تو میں تمہیں اس روز گھر سے باہر نکال دوں گا۔ سمجھ گئے؟"

ثقلین سمجھ گیا تھا چنانچہ وہ ہر روز صرف ایک سگریٹ لاتا تھا اور پاخانے میں جا کر پیا کرتا تھا۔

ثقلین سے میں تین برس چھوٹا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میرا سگریٹ پینا اور وہ

بھی بازاروں میں کھلے بندوں ۔۔۔۔ اباجی کسی طرح بھی برداشت نہ کرتے
ثقلین کو تو انہوں نے صرف دھمکی دی تھی مگر مجھے وہ یقیناً گھر سے باہر
نکال دیتے ۔

گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے غسل خانے میں جا کر صدق دل
سے دعا مانگی کہ اے خدا اباجی کو میرے سگریٹ پینے کا کچھ علم نہ ہو ۔
دعا مانگنے کے بعد میرے دل پر سے خوف کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور میں اوپر
چلا گیا ۔

آپ کہیں گے کہ میں خاص طور پر غسل خانے میں داخل ہو کر ہی کیوں
دعا مانگتا تھا ۔ دعا کہیں بھی مانگی جا سکتی ہے ۔ درست ہے لیکن مصیبت
یہ ہے کہ میں دل میں اگر کوئی بات سوچوں تو اس کے ساتھ اور بہت سی
غیر ضروری باتیں خود بخود آ جاتی ہیں ۔ میں نے گھر لوٹتے ہوئے راستے
میں دعا مانگی تھی مگر میرے دل میں کئی اوٹ پٹانگ باتیں پیدا ہو گئی
تھیں ۔ دعا اور یہ باتیں غلط ملط ہو کر ایک بے ربط عبارت بن گئی تھی ۔

"اللہ میاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے سگریٹ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیڑا غرق
ایک پوری ڈبیا سگرٹوں کی میرے نیکر کی جیب میں پڑی ہے ۔ اگر کسی نے
دیکھ لی تو کیا ہو گا ۔۔۔۔ کہیں ثقلین ہی نہ لے اڑے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اللہ میاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سگریٹ پینے میں کیا برائی
ہے ؟ اباجی نے چھٹی جماعت سے پینے شروع کئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اللہ میاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سگریٹ والے کے ساڑھے تیرہ آنے میری طرف

نکلتے ہیں۔ اِن کی ادائیگی کیسے ہوگی اور اسکول میں مٹھائی والے کے بھی چھ آنے دینا ہیں ...... مٹھائی اس کی بالکل واہیات ہے لیکن میں کھاتا کیوں ہوں؟ .... اللہ میاں مجھے معاف کردے .... جو سگریٹ اباجی پیتے ہیں ان کا مزا کچھ اور ہی قسم کا ہوتا ہے — پان کھاکر سگریٹ پینے کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے ..... اللہ میاں ..... اب کے تھر پہ جائیں گے تو سگرٹوں کا ڈبہ ضرور خریدیں گے ...... کب تک سگریٹ والا ادھار دیتا جائے گا۔ امّی جان کا بٹوہ ..... اللہ میاں مجھے معاف کردے۔"

میں دل ہی میں خاموش دعا مانگوں تو یہی گڑبڑ ہوجاتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مجھے غسل خانے کے اندر جانا پڑتا تھا۔ دروازہ بند کرکے میں وہاں اپنے خیالات کو آوارہ نہیں ہونے دیتا تھا۔ میلی چھت کی طرف نگاہیں اُٹھائیں۔ سانس روکا اور ہولے ہولے دعا گنگنانا شروع کردی عجیب بات ہے کہ جو دعا میں نے اِس غلیظ غسل خانے میں مانگی، قبول ہوئی انار کی چوری کا اباجی کو کچھ علم نہ ہوا۔ سگریٹ پینے کے متعلق بھی وہ کچھ جان نہ سکے اس لئے کہ اُن کا دوست اس روز شام کو کلکتے چلا گیا جہاں اس نے مستقل رہائش اختیار کرلی۔

غسل خانے سے میرا اعتقاد اور بھی پختہ ہوگیا۔ جب میں نے دسویں جماعت کا امتحان دینے کے دوران میں دعا مانگی اور وہ قبول ہوئی۔ جیومیٹری کا پرچہ تھا۔ میں نے غسل خانے میں جاکر تمام پرا پوزیشن

کتاب سے پھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیں اور دعا مانگی کر کسی ممتحن کی نظر نہ پڑے اور میں اپنا کام اطمینان سے کر لوں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ میں نے پھاڑے ہوئے اوراق نکال کر کاغذوں کے نیچے ڈسک پر رکھ لئے۔ اور اطمینان سے بیٹھا نقل کرتا رہا۔

ایک بار نہیں پچیسوں بار میں نے اِس غسل خانے میں حالات کی نزاکت محسوس کر کے دعا۔ مانگی جو قبول ہوئی۔ میرے بڑے بھائی ثقلین کو اس کا علم تھا۔ مگر وہ میری ضعیف الاعتقادی سمجھتا تھا —— بھئی کچھ بھی ہو۔ میرا تجربہ یہی کہتا ہے کہ اس غسل خانے میں مانگی ہوئی دُعا کبھی خالی نہیں گئی۔ میں نے اور جگہ بھی دعائیں مانگ کر دیکھی ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی قبول نہیں ہوئی —— کیوں؟ —— اس کا جواب نہ میں دے سکتا ہوں اور نہ میرا بڑا بھائی ثقلین —— ممکن ہے آپ میں سے کوئی صاحب دے سکیں۔

چند برس پیچھے کا ایک دلچسپ واقعہ آپ کو سُناتا ہوں۔ میرے چچا جان کی شادی تھی۔ آپ سنگاپور سے اس غرض کے لئے آئے تھے۔ چونکہ ان کا اور ہمارا گھر... بالکل ساتھ ساتھ ہے اس لئے جتنی رونق ان کے مکان میں تھی۔ اتنی ہی ہمارے مکان میں بھی تھی۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی ہا کیونکہ لڑکی والے ہمارے گھر آگئے تھے۔ آدھی آدھی رات ڈھولک کے گیت گائے جاتے تھے۔ ہونے والی دلہن سے چھیڑ چھاڑ، عجیب و غریب رسمیں۔ تیل۔ مہندی اور

نامعلوم کیا کیا کچھ ـــــ بچوں کی چیخ و پکار۔ الھڑ لڑکیوں کی نئی گرگابیوں اور سینڈلوں میں ایک چلت پھرت ـــــ اوٹ پٹانگ کھیل ـــــ غرض کہ ہر وقت ایک ہنگامہ مچا رہتا تھا۔

جب اس قسم کی خوشگوار افراتفری پھیلی ہو تو لڑکیوں کو چھیڑنے کا بہت لُطف آتا ہے بلکہ یوں کہئے کہ شادی بیاہ کے ایسے ہنگاموں ہی پر لڑکیوں کو چھیڑنے کا موقعہ ملتا ہے ـــــ ہمارے دور کے رشتہ دار شالباف تھے ان کی لڑکی مجھے بہت پسند تھی۔ اس سے پہلے تین چار مرتبہ ہمارے یہاں آچکی تھی۔ اس کو دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک رُکی ہوئی ہنسی ہے ـــــ نہیں۔ میں اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح بیان نہیں کرسکا ـــــ اس کا سارا وجود کھلکھلا کر ہنس اٹھتا اگر اس کو ذرا سا چھیڑ دیا جاتا۔ بالکل ذرا سا یعنی اس کو اگر صرف چھو لیا جاتا تو بہت ممکن ہے وہ ہنسی کا فوّارہ بن جاتی ـــــ اس کے ہونٹوں اور اس کی آنکھوں کے کونوں میں۔ اس کی ناک کے ننھے ننھے نتھنوں میں۔ اس کی پیشانی کی مصنوعی تیوریوں میں اس کے کان کی لوؤں میں ہنسی کے ارادے مرتعش رہتے تھے ـــــ میں نے اس کے چھیڑنے کا پورا تہیہ کر لیا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سیڑھیوں کی بتّی خراب ہوگئی۔ بلب فیوز ہوا یا کیا ہوا بہر حال اچھا ہوا کیونکہ وہ بار بار کبھی نیچے آتی تھی اور کبھی اوپر جاتی تھی۔ میں غسل خانے کے پاس اندھیرے میں ایک طرف ہو کر

کھڑا ہو گیا ـــــ وہ اوپر جاتی یا نیچے جاتی مجھ سے اُس کی مڈ بھیڑ ضرور ہوتی اور میں اندھیرے میں اس سے فائدہ اٹھا کر اپنا کام کر جاتا ـــــ بات معقول تھی چنانچہ میں کچھ دیر دم سادھے اُس کا منتظر رہا۔ اور اس دوران میں اپنی آنکھوں کو تاریکی کا عادی بناتا رہا۔

کسی کے نیچے اُترنے کی آواز آئی ـــــ کھٹ ـــــ کھٹ ـــــ کھٹ ـــــ میں تیار ہو گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابا جی تھے۔ انہوں نے پوچھا کون ہے؟ ـــــ میں نے کہا "جی! عباس" ـــــ اُنہوں نے اندھیرے میں ایک زور کا طمانچہ میرے منہ پر مارا اور کہا "تمہیں شرم نہیں آتی۔ یہاں چھپ کر لڑکیوں کو چھیڑتے ہو۔ ثریا ابھی ابھی اپنی ایک سہیلی سے تمہاری اس بیہودہ حرکت کا ذکر کر رہی تھی۔ اگر اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا تو جانتے ہو کیا ہو گا؟ ـــــ واہیات کہیں کے! ـــــ تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں اپنے بڑوں کی آبرو ہی کا کچھ لحاظ کرو ـــــ اور ثریا کی ماں نے آج ہی ثریا کے لئے تمہیں مانگا ہے ـــــ لعنت ہو تم پر۔"

کھٹ کھٹ ـــــ کسی کے نیچے اُترنے کی آواز آئی۔ ابا جی نے میرے حیرت زدہ منہ پر ایک اور طمانچہ رسید کیا اور بڑبڑاتے چلے گئے۔

کھٹ کھٹ کھٹ ـــــ ثریا تھی ـــــ میرے پاس سے گزرتے ہوئے ایک لحظے کے لئے ٹھٹکی اور حیا آلود غصے کے ساتھ یہ کہتی چلی گئی۔

"خبردار جو اب آپ نے مجھے چھیڑا۔ امّی جان سے کہہ دوں گی۔"

میں اور بھی زیادہ متحیر ہوگیا۔ دماغ پر بہت زور دیا مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ اتنے میں غسل خانے کا دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور ثقلین باہر نکلا میں نے اس سے پوچھا "تم یہاں کیا کر رہے تھے؟"

اس نے جواب دیا "دُعا مانگ رہا تھا"

میں نے پوچھا "کس لئے"

مسکرا کر اس نے کہا "ثریا کو میں نے چھیڑا تھا"

میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ اس غسل خانے میں جو دعا مانگی جائے ضرور قبول ہوتی ہے۔